ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ



پان والی کوٹھی، دُودھ پور، علی گڑھ
۲۰۲۰۰۱

ادارہ تحقیق وتصنیفِ اسلامی کا سہ ماہی ترجمان

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

مدیر

سید جلال الدین عمری

پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ
۲۰۲۰۰۱

سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ

جلد ۵ شمارہ ۱

جمادی الاولیٰ - رجب المرجب ۱۴۰۹ھ
جنوری ـــــ مارچ ۱۹۸۹ء

سالانہ زرتعاون

ہندوستان سے عام ایڈیشن ۳۰ روپئے
ـــــ لائبریری ایڈیشن ۵۰ روپئے
پاکستان سے ـــــ ۱۰۰ روپئے
دیگر ممالک سے ـــــ ۲۰ ڈالر

فی شمارہ عام ایڈیشن ۸ روپئے
فی شمارہ لائبریری ایڈیشن ۱۵ روپئے

ھندوستان میں

طابع وناشر سید جلال الدین عمری نے انٹرنیشنل پرنٹنگ پریس علی گڑھ کے لیے نازیہ پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، پان والی کوٹھی دودھ پور علی گڑھ سے شائع کیا۔

فہرست مضامین

حرفِ آغاز

ادارۂ تحقیق کے آٹھ سال (ماضی کا ایک جائزہ)	سید جلال الدین عمری	۵

تحقیق وتنقید

ملت ابراہیمی کے ترکیبی عناصر	مولانا محمد رضی الاسلام ندوی	۱۱
حضرات صوفیہ اور علم حدیث	ڈاکٹر غلام قادر لون	۴۳
عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان میں تاریخ نگاری	پروفیسر اقتدار حسین صدیقی	۶۱

بحث ونظر

اسلام میں رفاہی خدمات کا تصور	سید جلال الدین عمری	۷۴
اوقات صلوٰۃ برائے اعلیٰ عرض البلد	ڈاکٹر طارق منیر	۱۰۱
تشریح وتوضیح	ڈاکٹر حسن الدین	۱۰۷

ترجمہ وتلخیص

ترکی اور مشرقی عرب میں عربی چھاپے خانے کا قیام	تعریب: ڈاکٹر مقصود احمد ترجمہ: جناب ابوسفیان اصلاحی	۱۱۱

تعارف وتبصرہ

اسلام اور جدید سائنس	ڈاکٹر محمد ریاض کرمانی	۱۱۸

اس شمارہ کے لکھنے والے

۱۔ مولانا محمد رضی الاسلام ندوی
اجمل خاں طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۲۔ ڈاکٹر غلام قادر لون
حدی پورہ، بارہ مولہ، کشمیر

۳۔ پروفیسر اقتدار حسین صدیقی
پروفیسر شعبہ تاریخ۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۴۔ ڈاکٹر طارق منیر

۵۔ ڈاکٹر حسن الدین
۹۵۔ اے کلاس، نیو ملک پیٹ، حیدرآباد

۶۔ ڈاکٹر مقصود احمد
لکچرر شعبہ عربی، بڑودہ یونیورسٹی، بڑودہ

۷۔ ڈاکٹر محمد ریاض کرمانی
سینٹر فار اسٹڈیز ان سائنس، علی گڑھ

۸۔ سید جلال الدین عمری
سکریٹری ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ

خوش نویس
احراز الحسن جاوید

حرفِ آغاز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ادارۂ تحقیق کے آٹھ سال

(ماضی کا ایک جائزہ)

سیّد جلال الدین عمری

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے متصل، سول لائنس کا ایک علاقہ دودھ پور ہے۔ یہاں کی بیشتر آبادی یونیورسٹی سے متعلق افراد پر مشتمل ہے۔ پان والی کوٹھی اسی علاقہ میں ہے۔ اس کی پشت پر کرایہ کے تین کوارٹرس میں ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ قائم ہے۔ موجودہ شکل میں ادارہ کا قیام اپریل ۱۹۸۱ء کو عمل میں آیا۔ بات کل کی معلوم ہوتی ہے لیکن دیکھتے دیکھتے آٹھ برس کا عرصہ گزر گیا۔

ادارہ کے مقاصد

ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی ایک رجسٹرڈ سوسائٹی کے تحت قائم ہے۔ اس کے دستور میں اس کے حسب ذیل مقاصد بیان کیے گئے ہیں۔ (ادارہ کا دستور انگریزی میں شائع ہو چکا ہے)

۱۔ ایسی تصنیفات کا تیار کرنا جو اسلامی فکر کی ترجمانی کرتی ہوں اور جن کے ذریعہ موجودہ دور میں اسلام کا صحیح تعارف ہو سکے۔

۲۔ اہم کتابوں کا ترجمہ کرنا، خاص طور پر اردو، عربی، انگریزی اور ہندی میں۔

۳۔ قابل اور باصلاحیت افراد کی تربیت کرنا تاکہ وہ :-

(الف) اسلامی موضوعات پر ریسرچ کر سکیں (ب) ایسا لٹریچر تیار کریں جو اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں معاون ہو۔ (ج) اور اہم اسلامی کتابوں کا مختلف زبانوں میں ترجمہ کر سکیں۔

(۴) قرآن، حدیث اور اسلامی موضوعات کی تعلیم کے لیے مراسلاتی کورس جاری کرنا۔

(۵) قرآن و حدیث کی تعلیمات کو اس طرح عام کرنا کہ مسلمان نوجوان نہ صرف یہ کہ اسلام کے وفادار بن کر زندگی گزاریں بلکہ اسے دنیا کے سامنے بے کم و کاست اس کی روح اور قالب کے ساتھ پیش کر سکیں۔

۶۔ ادارہ کے اسکالرس اور دوسرے محققین کی تصنیفات کی اشاعت کا نظم کرنا۔
۷۔ اردو، انگریزی اور عربی میں رسائل اور مجلات کا جاری کرنا۔
۸۔ لائبریری کا قیام جس سے ریسرچ اور تحقیق کے کاموں میں مدد ملے۔

یہ عظیم منصوبہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ مختلف صلاحیتوں کے افراد اس کے لیے پوری طرح وقف ہو جائیں اور اپنی زندگیاں اس میں کھپا دیں۔

ادارہ کی بنیاد جن بزرگوں نے رکھی وہ سب معروف اصحاب علم و فضل ہیں اور انھیں تصنیف و تالیف اور صحافت کا وسیع تجربہ ہے، اس وجہ سے خدا کا شکر ہے ادارہ کو شروع ہی سے ایک علمی وقار حاصل ہے اور اس کے بارے میں حسن ظن اور اعتماد پایا جاتا ہے۔ یہ اعتماد اور حسن ظن ادارہ کا بہت بڑا سرمایہ ہے۔ ادارہ کے کام کا آغاز اس طرح ہوا کہ ہند و پاک کے مشہور عالم دین، صاحب قلم اور تحریک اسلامی کے چوٹی کے راہنما مولانا صدر الدین اصلاحی مدظلہ اس کے صدر تھے[1] اور مجھ جیسے کم علم اور ناتجربہ کار شخص پر سکریٹری شپ کی ذمہ داری ڈالی گئی۔ ہم دونوں کے ساتھ صرف ایک رفیق مولانا سلطان احمد اصلاحی اس کام کے لیے فارغ تھے۔ جہاں تک مالی وسائل کا تعلق ہے اس کا کوئی مستقل نظم نہ اس وقت تھا نہ اب ہے۔ اس بے سروسامانی کی حالت میں ادارہ نے جو تھوڑی بہت خدمت انجام دی ہے وہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے۔ اس کی عنایت کے بغیر کوئی بھی کار خیر نہ ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

ادارہ سے آپ کی محبت اور آپ کا تعلق خاطر اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس کے کاموں سے آپ واقف ہوں، مشورے دیں، تعاون کریں اور اسے آگے بڑھائیں۔ اسی مقصد سے یہاں اس کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

ادارہ کے منصوبہ کے تحت حسب ذیل شعبے اس وقت تک وجود میں آچکے ہیں۔
(۱) تصنیف و تالیف (۲) تراجم (۳) تصنیفی تربیت۔ (۴) تحقیقات اسلامی۔ (۵) لائبریری (۶) مکتبہ
ان کی کارکردگی کی تھوڑی سی تفصیل یہاں پیش کی جا رہی ہے۔

شعبۂ تصنیف و تالیف

ادارہ کے مقاصد میں اس شعبہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اور اول روز سے یہ شعبہ قائم

[1] مولانا محترم اپنی مسلسل گرتی ہوئی صحت کے پیش نظر ۱۹۸۵ء میں ادارہ کی صدارت سے سبک دوش ہو گئے اور برادر مکرم مولانا محمد فاروق خاں اس کے صدر منتخب ہوئے۔

ہے۔ اس کے تحت اس کے کارکنوں کی حسب ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں

(۱) تلخیص تفہیم القرآن — مولانا صدرالدین اصلاحی[1]
(۲) معرکۂ اسلام وجاہلیت — "
(۳) مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ — سید جلال الدین عمری
(۴) اسلام اور مشکلات حیات — "
(۵) مشترک خاندانی نظام اور اسلام — مولانا سلطان احمد اصلاحی

اس دوران میں مولانا محمد سعود عالم قاسمی کی کتاب 'فتنۂ وضع حدیث' مولانا سلطان احمد اصلاحی اور راقم کے بعض کتابچے مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی سے شائع ہوئے۔

ادارہ کے کارکنوں کی تحریروں کی اشاعت کے ساتھ اس بات کی بھی کوشش رہی کہ باہر کے اصحاب قلم کی ایسی نگارشات بھی شائع کی جاتی رہیں جو ادارہ کے مقاصد سے فی الجملہ ہم آہنگ ہوں۔ اس کے نتیجہ میں تین وقیع کتابیں شائع ہوئیں۔

۱۔ عہد نبوی کے غزوات وسرایا — ڈاکٹر رؤف اقبال۔ صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
۲۔ تصوف ۔ ایک تجزیاتی مطالعہ — ڈاکٹر عبیداللہ فراہی۔ ریڈر شعبۂ عربی۔ لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ
۳۔ ایمان وعمل کا قرآنی تصور — حکیم الطاف احمد اعظمی۔ ہمدرد انسٹی ٹیوٹ۔ نئی دہلی۔

ادارہ کی سب ہی مطبوعات کو بحمداللہ مقبولیت حاصل ہوئی اور وہ پاکستان سے بھی شائع ہوئیں۔

ادارہ کے کارکنوں کے بعض مسودات اس وقت تیار ہیں ان کی اشاعت کا نظم کرنا ہے۔

۱۔ اسلام کا تصور مذہب — مولانا سلطان احمد اصلاحی

---

[1] جدید ذہن کو اسلام سے قریب کرنے میں مولانا مودودیؒ کی تفہیم القرآن نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ یہ تفسیر چھ ضخیم جلدوں میں ہے۔ مختلف وجوہ سے اس کی تلخیص کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ مولانا صدرالدین اصلاحی اس کی تلخیص کا کام پہلے سے کر رہے تھے۔ ادارۂ تحقیق کے وجود میں آنے کے بعد بھی اسے جاری رکھا اور اسے مکمل فرمایا۔ یہ کتاب بڑی تقطیع کے ۱۱۷۵ صفحات میں ہے اور مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی سے اب تک اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

۲۔ اسلامی تہذیب کا مزاج — مولانا سعود عالم قاسمی

حسب ذیل موضوعات پر ادارہ میں کام ہو رہا ہے اور یہ سب تکمیل کے مختلف مراحل میں ہیں۔

۱۔ اسلام میں خدمتِ خلق کا تصور — سید جلال الدین عمری
۲۔ کم زور طبقات اور اسلام — "
۳۔ بعض مباحث دعوت — "
۴۔ اباحیت پسندی اور اسلام — مولانا سلطان احمد اصلاحی
۵۔ صحابہ کرام کی معاشرت — محمد اسلام عمری

شعبۂ تراجم

بین الاقوامی سطح پر اسلام کے تعارف اور اسلام پر ریسرچ اور تحقیق کے کام کو آگے بڑھانے کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامیات کی اہم تصنیفات کا ترجمہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ہو تاکہ زبان کی اجنبیت اسلامی مفکرین کے خیالات سے استفادہ کی راہ میں رکاوٹ نہ رہے۔ اس شعبہ نے عربی، اردو، انگریزی اور ہندی زبانوں کو خاص طور پر پیش نظر رکھا ہے۔

عربی کو یہ امتیاز اور خصوصیت حاصل ہے کہ وہ قرآن، حدیث اور اسلام کے بنیادی مآخذ کی زبان ہے دورِ جدید میں زندگی کے مختلف مسائل پر اسلامی نقطۂ نظر سے لکھنے والے بھی اس زبان کو بہت ملے ہیں۔ اس شعبہ کا ایک ہدف یہ ہے کہ عربی کی قدیم اور جدید اہم تصنیفات کو اردو اور دوسری زبانوں میں منتقل کیا جائے۔ عربی کے بعد اسلامیات کا سب سے زیادہ ذخیرہ اردو زبان میں موجود ہے۔ اس کی بعض تصنیفات اس قابل ہیں کہ ان سے اہل عرب واقف ہوں۔ انگریزی کو بین الاقوامی اہمیت حاصل ہے لیکن اسلام کی صحیح ترجمانی کرنے والی تصنیفات اس میں کم ہی پائی جاتی ہیں۔ خیال یہ ہے کہ عربی اور اردو کی بعض اہم تصنیفات کو انگریزی میں منتقل کیا جائے۔ ہندی ہمارے ملک کی سرکاری زبان ہے اور وسیع علاقہ میں بولی جاتی ہے۔ اسلامیات پر اس میں کام نہ ہونے کے برابر تھا، اس کا آغاز ہو چکا ہے لیکن ترجمہ کا میدان ابھی ایک لحاظ سے خالی ہے۔ اس شعبہ کے پروگرام میں ہندی میں ترجمہ بھی داخل ہے۔ یہ ایک مشکل کام ہے۔ اس کے لیے جن مالی وسائل کی ضرورت

ہے وہ فی الحال ادارہ کو حاصل نہیں ہیں لیکن پھر بھی یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ کام کا آغاز ہو چکا ہے۔ اب تک اردو کے سات ایسے رسائل اور کتابچوں کا انگریزی ترجمہ شائع ہو چکا ہے جن سے اسلام کو اس کے صحیح خدوخال کے ساتھ سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ ان کتابچوں کے نام یہ ہیں:۔

۱۔ دین کا مطالعہ HOW TO STUDY ISLAM ?

۲۔ مسلمان اور دعوت اسلام MUSLIM AND DAWAH OF ISLAM.

۳۔ راہِ حق کے مہلک خطرے۔ PITFALLS ON THE PATH OF ISLAMIC MOVEMENT

۴۔ اسلام کا نظامِ معیشت۔ ISLAMIC ECONOMIC ORDER

یہ کتابچے مولانا صدرالدین اصلاحی کے تصنیف کردہ ہیں۔ راقم کے بھی حسب ذیل کتابچوں کا انگریزی ترجمہ ہو چکا ہے۔

۵۔ اسلام کے بنیادی عقائد۔ ISLAM THE UNIVERSAL TRUTH.

۶۔ اسلام اور وحدت بنی آدم۔ ISLAM THE UNITY OF MAN KIND.

۷۔ اسلام ۔ ایک دین دعوت ISLAM THE RELIGON OF DAWAH.

نسبتاً دو ضخیم کتابوں کے ترجمے ادارہ کے پاس موجود ہیں۔ ان کی اشاعت کا نظم کرنا ہے۔ ان میں سے ایک ہے 'قرآن مجید کا تعارف' جو مولانا صدرالدین اصلاحی کی تصنیف ہے اور دوسری ہے راقم کی کتاب 'عورت اور اسلام'۔

یہ تمام ترجمے ادارہ سے ہمدردی رکھنے والے دوستوں اور رفیقوں نے اعزازی طور پر کیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو اجرِ عظیم سے نوازے۔

عربی سے اردو اور اردو سے عربی میں ترجمہ کا کام خواہش کے باوجود نہیں ہو سکا ہے۔ البتہ راقم کی کتاب معروف و منکر کا عربی ترجمہ کویت سے شائع ہو چکا ہے۔ اب تک اس کے دو تین ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ خدا کا شکر ہے علمی حلقوں میں مقبول ہے۔ ترجمہ ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی کے قلم سے ہے۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ بھی نکل چکا ہے۔ راقم ہی کی ایک دوسری کتاب 'اسلام کی دعوت' کا برادرم رضی الاسلام ندوی نے عربی میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ اس وقت کویت میں ہے۔ ابھی اس کی اشاعت عمل میں نہیں آئی ہے۔

شعبۂ تصنیفی تربیت

ادارہ میں تصنیفی تربیت کا پروگرام جاری ہے۔ اس پروگرام کے تحت دینی درس گاہوں،

کالجوں اور یونیورسٹیوں سے فارغ طلبہ کو تصنیف و تالیف اور ترجمہ کی دو سالہ تربیت دی جاتی ہے۔ اس کا ایک جامع نصاب ہے۔ اس کے تحت طلباء منصوبہ بند طریقہ سے اسلام اور جدید افکار کے مطالعہ کے بعد تصنیف و تالیف کی کوشش کرتے ہیں۔

ادارہ کی نگرانی میں طلباء کا 'رائٹرس فورم' قائم ہے جس کے تحت ادارہ کے زیر تربیت اسکالرس اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے بعض باذوق طلباء ہر ماہ ادارہ میں دو بار جمع ہوتے ہیں۔ بالعموم یونیورسٹی کے کسی استاذ یا ادارہ کے کسی رفیق کی صدارت میں مقالات پیش کرتے ہیں، ان پر بحث اور گفتگو ہوتی ہے اور انھیں موضوع سے متعلق ضروری مشورے دئے جاتے ہیں۔

ادارہ کے زیر تربیت طلباء کو ادارہ ہی میں قیام کی سہولت حاصل ہے۔ اس کے ساتھ انھیں وظائف بھی دئے جاتے ہیں۔ افراد اور وسائل کی کمی کی وجہ سے اس پروگرام کو زیادہ توسیع نہیں دی جاسکی تھی اب ادارہ نے اسے زیادہ مفید اور موثر بنانے کے سلسلے میں بعض نئے اقدامات کا فیصلہ کیا ہے۔ توقع ہے کہ اس شعبہ سے ادارہ کے مقاصد کو پورا کرنے میں بڑی مدد ملے گی اور اسلام کی علمی خدمت بہتر طریقہ سے انجام پائے گی۔

ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی کی ایک تازہ پیش کش

مولانا سید جلال الدین عمری کی نئی کتاب

اسلام اور مشکلات حیات

- اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے نافرمانوں پر مشکلات اور مصائب کیوں آتے ہیں؟
- اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کو بھی اور اجتماعی، شخصی اور انفرادی مشکلات سے کیوں گزارا جاتا ہے؟
- امراض، جسمانی تکالیف، مالی مشکلات، حادثات اور صدمات میں ایک مومن کا کیا رویہ ہونا چاہیے؟
- مرض اور مشکلات حیات میں خودکشی کیوں ناجائز ہے؟
- مرض کی شدت میں کسی کی جان کیوں نہیں لی جاسکتی؟

یہ کتاب قرآن و حدیث کی روشنی میں ان سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے، مؤثر انداز بیان، دل نشیں بحث اور علمی اسلوب۔ آفسٹ کے حسین طباعت، خوب صورت سرورق۔ ضخامت ۸۸ صفحات۔ قیمت ۸ روپے

ملنے کا پتہ: مینجر مکتبہ تحقیق و تصنیف اسلامی۔ پان والی کوٹھی۔ دودھ پور علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

تحقیق وتنقید

ملّت ابراہیمی کے ترکیبی عناصر

جناب محمد رضی الاسلام ندوی

قرآن کریم کے اوّلین مخاطب مشرکین عرب، یہود اور نصاریٰ تھے اور تینوں ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف اپنا انتساب کرتے تھے، خود کو ان کے طریقہ و مسلک کا پیرو بتلاتے تھے اور کہتے تھے کہ ہمارا مذہب بعینہٖ وہی ہے جو حضرت ابراہیم کا تھا۔ لیکن قرآن کریم نے متعدد مقامات پر ان کی تردید کی ہے، ان مذاہب میں شامل مشرکانہ اور باطل عقائد اور غیر الٰہی اجزا پر کاری ضرب لگائی ہے اور ان کے اس دعوی کا ابطال کیا ہے کہ وہ طریقۂ ابراہیمی کے پیرو ہیں۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ	اے اہل کتاب تم ابراہیم (کے دین) کے
فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَ	بارے میں کیوں جھگڑا کرتے ہو؟ تورات اور
الْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا	انجیل تو ابراہیم کے بعد ہی نازل ہوئی ہیں۔
تَعْقِلُوْنَ ۝ ..... مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا	پھر کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے..... ابراہیم
وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا	نہ یہودی تھا نہ عیسائی بلکہ وہ تو مسلم حنیف
وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (آل عمران: ۶۵-۶۷)	تھا اور وہ ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھا۔

قرآن کہتا ہے کہ توریت و انجیل تحریف کا شکار ہو چکی ہیں اور یہود و نصاریٰ نے خواہشات نفس کی پیروی کرتے ہوئے خدائی تعلیمات میں اپنی طرف سے بے بنیاد اور باطل چیزیں شامل کر لی ہیں۔ اس لیے اب ہدایت یہودیت سے حاصل ہو سکتی ہے نہ عیسائیت سے، بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ ملت ابراہیمی کی طرف رجوع کیا جائے اور صرف اسی کی پیروی کی جائے:

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا	یہودی کہتے ہیں: یہودی ہو تو راہ راست
قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا	پاؤ گے عیسائی کہتے ہیں عیسائی ہو تو ہدایت ملے گی۔
كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (البقرہ: ۱۳۵)	ان سے کہو نہیں بلکہ سب کو چھوڑ کر ملت ابراہیمی کی پیروی کرو۔ اور ابراہیم مشرکوں میں سے نہ تھا۔

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۫ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ	کہو اللہ نے جو کچھ فرمایا ہے سچ فرمایا ہے
اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ	تم کو ابراہیم حنیف کی ملت کی پیروی کرنی
الْمُشْرِكِيْنَ ۝	چاہیے اور ابراہیم شرک کرنے والوں میں
(آل عمران - ۹۵)	سے نہ تھا۔

قرآن کی اس دعوت کی معنویت اس وقت اور بھی آشکارا ہوتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہود، نصاریٰ اور مشرکین عرب تینوں اپنا شجرۂ نسب حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جوڑتے ہیں۔ قرآن انھیں کسی غیر معروف اور اجنبی چیز کی طرف دعوت نہیں دے رہا ہے بلکہ انھیں خود ان کے جدِ امجد حضرت ابراہیم کی ملت کے اتباع کی طرف بلا رہا ہے۔ اس لیے عقل و منطق کا عین تقاضا ہے کہ ملتِ ابراہیمی کی بے چون و چرا پیروی کی جائے اور جن چیزوں کا بعد میں اپنی طرف سے اضافہ کر کے انھیں مذہب میں شامل کر لیا گیا ہے انھیں ترک کر دیا جائے۔

پیشِ نظر مقالہ میں اس بات کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے کہ ملت ابراہیمی سے کیا مراد ہے؟ اس کے اہم اور بنیادی عناصر کیا ہیں؟ حضرت ابراہیم کی اصولی تعلیمات کیا تھیں؟ اور ملتِ ابراہیمی کی اتباع سے مراد کن چیزوں کی اتباع ہے؟ چونکہ قرآن نے یہود و نصاریٰ کو بھی ملتِ ابراہیمی کی اتباع کی دعوت دی ہے اس لیے کوشش کی گئی ہے کہ ملتِ ابراہیمی کے عناصر کی تحقیق کرتے ہوئے قرآن کے ساتھ ساتھ توریت اور انجیل کے بھی حوالے دیے جائیں تاکہ ان پر اتمام حجت ہو سکے۔

ملت کا مفہوم

لغت میں ملت سنت اور طریقہ کے معنی میں آتا ہے۔ لسان العرب میں ہے۔

قال ابو اسحاق: الملة فی اللغة	ابو اسحاق کہتے ہیں: لغت میں ملت کے
سنتهم وطریقهم[۱]	معنی سنت اور طریقہ کے ہیں۔

قرآن اور حدیث میں ملت کا استعمال اصولی طور پر دین کے معنی میں ہوا ہے۔ خواہ اللہ کی طرف سے نازل کردہ دین ہو یا تحریف شدہ یا خود انسانوں کا وضع کردہ۔ حضرت یوسفؑ نے اپنے جیل کے ساتھیوں کے سامنے دعوت پیش کی تو فرمایا۔

اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ	میں نے ان لوگوں کی ملت چھوڑ دی ہے

بِاللّٰہِ وَھُمْ بِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ کٰفِرُوْنَ (یوسف: ۳۷) جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں۔

انھوں نے توحید و آخرت کا انکار کرنے والوں کے مذہب کو ملت سے تعبیر کیا۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو اللہ پر ایمان لانے کی دعوت دی اور برابر تولنے کا حکم دیا تو اس نے وارننگ دیتے ہوئے کہا:

لَنُخْرِجَنَّكَ يَا شُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ (الاعراف: ۸۸)

اے شعیب ہم تجھے اور ان لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں اپنی بستی سے نکال دیں گے ورنہ تم لوگوں کو ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا۔

اس کے جواب میں حضرت شعیبؑ نے فرمایا:۔

قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ (الاعراف - ۸۹)

ہم اللہ پر جھوٹ گھڑنے والے ہوں گے اگر تمہاری ملت میں پلٹ آئیں۔

یہاں حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم نے بھی اپنے مذہب کو ملت کہا اور خود حضرت شعیبؑ نے بھی اسے ـــــ باوجودیہ کہ وہ باطل بنیادوں پر قائم تھا ـــــ ملت سے تعبیر کیا۔

ان سے پہلے قوم نوح، عاد اور ثمود بھی اپنے پیغمبروں سے کہہ چکی تھیں۔

لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا (ابراہیم - ۱۳)

ہم تمہیں اپنے ملک سے نکال دیں گے ورنہ تمہیں ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا۔

قرآن میں یہودیت اور نصرانیت کے لیے بھی ملت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نبی آخر الزماںؐ سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (البقرہ - ۱۲۰)

یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کی ملت کی اتباع نہ کرنے لگو۔

اصحاب کہف کی قوم عیسائیت کی پیرو تھی۔ جب اصحاب کہف نے توحید کی صدا بلند کی اور حق کا اعلان کیا تو اس معاشرہ میں ان کا رہنا دوبھر ہوگیا۔ اس وقت انھوں نے ایک غار میں پناہ لینے کا منصوبہ بنایا اور آپس میں مشورہ کرتے ہوئے اس اندیشہ کا اظہار کیا:

اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ

اگر کہیں ان لوگوں کا ہاتھ ہم پر پڑ گیا تو

يَرْجُمُوكُمْ أَوْ يُعِيدُوكُمْ فِي مِلَّتِهِمْ (الکہف : ۲۰)
بس سنگ سار ہی کر ڈالیں گے یا پھر زبردستی ہمیں اپنی ملت میں واپس لے جائیں گے۔

جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کی صدا بلند کی تو آپ کی قوم نے بڑے ہی استکبار سے کہا تھا:

مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْآخِرَةِ إِنْ هٰذَا إِلَّا اخْتِلَاقٌ (ص۔ ۷)
یہ بات ہم نے زمانۂ قریب کی ملت میں کسی سے نہیں سنی۔ یہ تو صرف ایک من گھڑت بات ہے۔

اس آیت میں 'ملت آخرۃ' سے کیا مراد ہے؟ اس میں کچھ اختلاف ہے۔ ابن جریر طبری نے حضرت ابن عباس، قرطبی اور سدی سے نقل کیا ہے کہ 'ملت آخرۃ' سے مراد نصرانیت ہے۔ جبکہ مجاہد اور قتادہ سے مروی ہے کہ اس سے مراد قریش کا مذہب ہے[۲]۔ بہرحال دونوں میں تحریف واقع ہوگئی تھی اور باطل عقائد و نظریات شامل ہوگئے تھے۔

اسی طرح ملت کا اطلاق اسلام پر بھی کیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے۔

لا يتوارث اهل ملتين[۳]
دو اشخاص جو الگ الگ ملت کی پیروی کرنے والے ہوں۔ ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔

دوسری حدیث سے اس کی تشریح ہوتی ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے ارشاد فرمایا:

لا يرث المسلم الكافر ولا الكافر المسلم[۴]
مسلمان اور کافر دونوں ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔

معلوم ہوا کہ ملت کا اطلاق اسلام پر بھی ہوتا ہے اور غیر اسلام یعنی کفر پر بھی۔

اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من حلف بملة غير الاسلام كاذبا متعمدا فهو كما قال[۵]
جو شخص اسلام کے علاوہ کسی دوسری ملت کی قسم کھائے اور جان بوجھ کر کذب بیانی کرے تو وہ ویسا ہی ہے جیسا کہ اس نے کہا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ملت کا اطلاق اسلام اور غیر اسلام دونوں پر ہوتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے:

كل مولود يولد على هذه الملة[۶]
ہر بچہ اسی ملت پر پیدا ہوتا ہے۔

اس حدیث میں ملت سے مراد اسلام یعنی فطرت الٰہی ہے۔

ملت کا اطلاق ایک مذہب کے مختلف فرقوں پر بھی کیا گیا ہے۔ مشہور حدیث ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

ان بنی اسرائیل تفرقت علی ثنتین وسبعین ملة، وتفترق امتی علی ثلاث وسبعین ملة کلهم فی النار الاملة واحدة، قالوا من هی یا رسول الله قال ما أنا علیه واصحابی ؎	بنی اسرائیل بہتر ملتوں میں بٹ گئے تھے اور میری امت تہتر ملتوں میں بٹ جائے گی لیکن سوائے ایک ملت کے سب جہنمی ہوں گے صحابہ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول وہ کون سی ملت ہوگی فرمایا وہ جو میرے اور میرے اصحاب کے طریقے پر قائم ہوگی۔

ایک دوسری روایت میں جسے ترمذی ہی نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے ملت کی جگہ فرقہ کا لفظ آیا ہے ؎ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث میں ملت کا استعمال فرقہ کے معنی میں ہوا ہے۔

راغب اصفہانی نے لکھا ہے:

الملة (کالدین) وهو اسم لما شرع الله تعالیٰ لعباده علی لسان الانبیاء لیتوصلوا به الی جوار الله ؎	دین کی طرح ملت بھی اس دستور الٰہی کا نام ہے جو اللہ اپنے بندوں کے لیے جاری فرماتا ہے تاکہ اس پر چل کر انسان قرب خداوندی حاصل کر سکے اور یہ دستور انبیاء کی وساطت سے بندوں تک پہنچتا ہے

امام راغب کا یہ بیان صحیح نہیں معلوم ہوتا اس لیے کہ پیچھے گزر چکا ہے کہ ملت کا اطلاق باطل مذہب پر بھی ہوتا ہے۔ ان کے اس قول کی تاویل مصنف لغات القرآن نے یہ کی ہے:

"شاید راغب کی مراد یہ ہو کہ ملت اصل میں تو دستور الٰہی کا ہی نام ہے جو انبیاء کی معرفت بھیجا جاتا ہے لیکن اگر انسانی دماغ کبھی اس میں خورد برد کر لیں اور بگاڑ دیں تب بھی بطور مجاز اس پر لفظ ملت کا اطلاق ہو جاتا ہے۔ کیونکہ خورد برد کرنے والوں کے دعوی میں تو شکستہ بریدہ دین یا دستور بھی اللہ کا بھیجا ہوا دین ہوتا ہے۔ واللہ اعلم" ؎

راغب اصفہانی نے ملت اور دین کا فرق بتلاتے ہوئے لکھا ہے کہ "لفظ ملت کی اضافت صرف کسی نبی کی طرف ہوتی ہے۔ اس کی نسبت نہ اللہ کی طرف ہوتی ہے اور نہ نبی کی امت کے کسی فرد کی طرف"[۱۱]

یہ بات بھی صحیح نہیں اس لیے کہ پیچھے ذکر کی ہوئی متعدد آیات میں ملت کی اضافت غیر انبیاء کی طرف موجود ہے مشہور حدیث ہے کہ جناب ابوطالب کے مرض الوفات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہاں مشہور سردارانِ مکہ ابوجہل اور عبداللہ بن ابی امیہ بن مغیرہ وغیرہ موجود تھے۔ آپؐ نے چچا سے فرمایا: اے چچا جان آپ لاالٰہ الا اللہ کہہ دیجئے تاکہ میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آپ کے لیے محاجہ کرسکوں۔ ان دونوں نے کہا اترغب عن ملۃ عبدالمطلب ؟ (کیا آپ عبدالمطلب کی ملت سے روگردانی اختیار کریں گے؟) چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انھیں بار بار لاالٰہ الا اللہ کی تلقین کرتے رہے اور وہ دونوں اس سے روکنے کی کوششیں کرتے رہے یہاں تک کہ جو آخری جملہ ابوطالب کی زبان سے نکلا وہ یہ تھا: علی ملۃ عبدالمطلب[۱۲] (میں عبدالمطلب کی ملت پر ہوں) اس حدیث میں بھی ملت کی اضافت غیر نبی کی طرف کی گئی ہے۔

راغب کے اس قول کی تاویل بھی مصنف لغات القرآن نے یہ کی ہے کہ "لفظ ملت کی انبیاء کے ساتھ تخصیص بھی امام کے اس نظریہ پر مبنی ہے کہ ملت صرف دستورِ الٰہی کا نام ہے جو انبیاء کی معرفت بھیجا جاتا ہے ورنہ غیر انبیاء کی طرف اضافت خود سورہ یوسف آیت ۳۷ میں موجود ہے"[۱۳]

راغب اصفہانی نے ملت کے اشتقاق کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

واصل الملۃ من امللت الکتاب، قال تعالیٰ (فلیملل ولیہ) وتقال الملۃ اعتباراً بالشئ الذی شرعہ اللہ[۱۴]	ملت کی اصل 'املت الکتاب' سے ہے جس کے معنی ہیں تحریر لکھوانا۔ ارشاد باری ہے "لکھوائے وہ شخص جس پر حق آتا ہے یعنی قرض لینے والا..... لیکن اگر قرض لینے والا نادان یا ضعیف ہو یا لکھوا نہ سکتا ہو تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ لکھوائے" اور ملت اس چیز کے اعتبار سے کہا جاتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے مشروع کیا ہے۔

لسان العرب میں ہے :

الملة : الدين لملة الاسلام والنصرانية واليهودية ،وقيل هي معظم الدين وجملة مايجئ به الرسل [۱۵]	ملت سے مراد دین ہے۔ مثلاً اسلام، نصرانیت اور یہودیت یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد دین کا بڑا حصہ اور پیغمبروں کی لائی ہوئی تعلیمات ہیں۔

اگرچہ بعض احادیث میں ملت کی اضافت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب بھی کی گئی ہے[۱۶] لیکن قرآن نے انبیاء میں سے صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف اس کی نسبت کی ہے۔ اس نے ملت ابراہیمی کو سیدھا سچا دین قرار دیا ہے (الانعام - ۱۶۱) لوگوں کو اس کے اتباع کی دعوت دی ہے (آل عمران - ۹۵، الحج - ۷۸) اس کی اتباع کرنے والوں کو بہترین دین کا پیرو (النساء - ۱۲۵) اور اس سے اعراض کرنے والے کو بیوقوف اور نادان قرار دیا ہے (البقرہ - ۱۳۰) حضرت یوسف اپنے آباء حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام کی ملت کی اتباع پر فخر کرتے ہیں (یوسف - ۳۸) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ملت ابراہیمی کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے (النحل - ۱۲۳)

ملتِ ابراہیمی کے بنیادی عناصر

حضرت ابراہیم علیہ السلام ان پیغمبروں میں سے ہیں جن پر کتاب نازل ہوئی۔ قرآن نے صحف ابراہیم کا تذکرہ دو مقامات پر کیا ہے (سورۂ النجم اور سورۂ الاعلیٰ) اور اس کی بعض تعلیمات کا حوالہ دیا ہے۔ آج اگر صحف ابراہیم دنیا میں موجود ہوتے[۱۷] تو وہ آپ کی تعلیمات اور آپ کی ملت کے عناصر جاننے کا بہترین ذریعہ ہوتے۔ لیکن چونکہ وہ زمانے کے ہاتھوں نابود ہو چکے ہیں اس لیے ملتِ ابراہیمی کے بارے میں ہمارے پاس معلومات کا ذریعہ صرف کتب مقدسہ ہیں۔ توریت کی کتاب پیدائش میں حضرت ابراہیم کا تفصیل سے تذکرہ موجود ہے۔ اس کی دوسری کتابوں اور اناجیل میں بھی آپ کے بارے میں بعض اشارات ملتے ہیں۔ لیکن توریت و انجیل میں تحریف اب پائے ثبوت کو پہنچ چکی ہے اور خود اہلِ کتاب اس کا اعتراف کرنے لگے ہیں[۱۸] پھر بھی بہت سی باتیں ان میں حقیقت سے قریب مل جاتی ہیں جن کی قرآن سے بھی تائید و تصدیق ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیم کی تعلیمات اور آپ کی ملت کے عناصر

جاننے کا سب سے مستند ذریعہ ہمارے پاس قرآن کریم ہے۔ قرآن نے آپ کی زندگی کے مختلف گوشوں کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ آپ کی تعلیمات کا مفصل تذکرہ کیا ہے۔ صحف ابراہیم کے حوالے دئے ہیں اور ملت ابراہیمی کے ارکان و عناصر کی طرف اشارات کیے ہیں۔ ذیل میں ہم توریت، انجیل اور قرآن کے حوالوں کی روشنی میں ملت ابراہیمی کے عناصر جاننے اور ان کی تفصیلات معلوم کرنے کی کوشش کریں گے۔

۱۔ توحید

حضرت ابراہیم کی زندگی کا نمایاں ترین وصف وحدانیت، خداوندی پر ایمان ہے۔ آپ نے ایسے معاشرہ میں پرورش پائی جو کفر و شرک اور بت پرستی میں ڈوبا ہوا تھا۔ صرف آپ کا معاشرہ ہی نہیں بلکہ تقریباً پوری دنیا شرک کی لپیٹ میں تھی بابل، شام اور مصر ہر جگہ اصنام پرستی زوروں پر تھی۔ خدائی کو سیکڑوں ہزاروں اصنام و اوثان میں تقسیم کر دیا گیا تھا[۱۹] آپ جس خاندان میں پیدا ہوئے وہ نہ صرف بت پرست تھا بلکہ اسے پروہت کا منصب بھی حاصل تھا۔ توریت انجیل اور قرآن سب اس پر متفق ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کا باپ بت سازی کرتا تھا اور اسے سوسائٹی میں اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ توریت میں ہے:

"خداوند اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ تمہارے آبا یعنی ابرہام اور ناخور کا باپ تارح وغیرہ قدیم زمانہ میں بڑے دریا کے پار رہتے اور دوسرے معبودوں کی پرستش کرتے تھے"[۲۰]

انجیل برناباس میں ہے:

"ابرہام کا باپ بت ساز تھا جو جھوٹے خدا بناتا اور پوجتا تھا"[۲۱]

"ہمارے باپ ابرہام کا باپ بے دین تھا کیوں کہ وہ باطل خدا بناتا اور پوجتا تھا"[۲۲]

قرآن کہتا ہے:

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً (الانعام: ۷۴)	ابراہیم کا واقعہ یاد کرو جب کہ اس نے اپنے باپ آزر سے کہا تھا: کیا تو بتوں کو خدا بناتا ہے؟

بت پرستی کے اس ماحول کے باوجود جس میں حضرت ابراہیم گھرے ہوئے تھے۔

آپ نے فطرتِ سلیم سے کام لیتے ہوئے معرفتِ الٰہی حاصل کی۔ بت پرستی کا انکار کیا شرک سے برارت ظاہر کی اور ببانگ دہل خدا کی وحدانیت کا اعلان کیا:

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ	میں نے تو یکسو ہو کر اپنا رخ اس ہستی
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا	کی طرف کر لیا جس نے آسمان اور زمینوں
اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝	کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے
(الانعام — ۷۹)	والوں میں سے نہیں ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصبِ رسالت سے سرفراز فرمایا تو آپ نے اپنے باپ، خاندان اور قوم کو دعوت دینی شروع کی انھیں شرک اور بت پرستی سے روکا۔ مختلف طریقوں سے انھیں سمجھانے کی کوشش کی، شرک کے معائب و نقائص اور برے نتائج بیان کیے اور صرف خدائے واحد کی عبادت کی طرف بلایا، قرآن نے مختلف سورتوں میں کہیں تفصیل اور کہیں اختصار سے آپ کی دعوت کو پیش کیا ہے[۲۳] سورہ شعراء میں ہے:

وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِیْمَ ۝ اِذْ	اور انھیں ابراہیم کا قصہ سنا دو جبکہ اس نے
قَالَ لِاَبِیْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝	اپنے باپ اور اپنی قوم سے پوچھا تھا کہ
قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا	یہ کیا چیزیں ہیں جن کو تم پوجتے ہو؟ انھوں
عٰكِفِیْنَ ۝ قَالَ هَلْ یَسْمَعُوْنَكُمْ	نے جواب دیا کچھ بت ہیں جن کی ہم پوجا کرتے
اِذْ تَدْعُوْنَ ۝ اَوْ یَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ	ہیں اور انہی کی خدمت میں ہم لگے رہتے ہیں۔
یَضُرُّوْنَ ۝ قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا	اس نے پوچھا کیا یہ تمہاری سنتے ہیں جب
كَذٰلِكَ یَفْعَلُوْنَ ۝ قَالَ اَفَرَءَیْتُمْ	تم انھیں پکارتے ہو؟ یا یہ تمہیں کچھ نفع
مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۝ اَنْتُمْ وَ	یا نقصان پہنچاتے ہیں؟ انھوں نے جواب
اٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ۝ فَاِنَّهُمْ	دیا نہیں بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا
عَدُوٌّ لِّیْۤ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ۝	ہی کرتے پایا ہے۔ اس پر ابراہیم نے کہا
الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ ۝	کبھی تم نے (آنکھیں کھول کر) ان چیزوں کو
وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ ۝	دیکھا بھی جن کی بندگی تم اور تمہارے پچھلے
وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ ۝	باپ دادا بجا لاتے رہے۔ میرے تو یہ
وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ ۝	سب دشمن ہیں بجز ایک رب العالمین کے

وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓـَٔتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ ○
(الشعرا: ۷۹-۸۲)

جس نے مجھے پیدا کیا پھر وہی میری رہنمائی فرماتا ہے۔ جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے۔ جو مجھے موت دے گا اور پھر دوبارہ مجھ کو زندگی بخشے گا اور جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ روز جزا میں وہ میری خطا معاف فرما دے گا۔

یہی نہیں بلکہ ایک موقع پر بت خانہ کے تمام بتوں کو پاش پاش کر کے قوم کے سامنے عملاً ان کی بے بضاعتی ثابت کر دی اور ان پر حجت تمام کر دی[۲۲] بعد میں جب قوم نے آپ کا رہنا دوبھر کر دیا تو حکم الٰہی سے ہجرت کر کے آپ جہاں جہاں بھی گئے وہاں لوگوں کو خدائے واحد کی طرف دعوت دی اور آخر میں جب "بے آب و گیاہ وادی" پہنچے تو وہاں خدائے واحد کی عبادت کے لیے خانۂ کعبہ کی بنیاد اٹھائی۔ اس وقت بھی اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ شرک سے دور رہو اور خانۂ کعبہ کی تعمیر توحید کے مرکز کی حیثیت سے کرو:

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِیْمَ مَكَانَ الْبَیْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِیْ شَیْـًٔا وَّطَهِّرْ بَیْتِیَ لِلطَّآىِٕفِیْنَ وَالْقَآىِٕمِیْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ○
(الحج - ۲۶)

یاد کرو وہ وقت جبکہ ہم نے ابراہیم کے لیے اس گھر (خانہ کعبہ) کی جگہ تجویز کی تھی اس ہدایت کے ساتھ کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام و رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔

حضرت ابراہیمؑ توحید پر کتنی سختی سے قائم تھے اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ آپ نے جب اللہ تعالیٰ سے شہر مکہ کو گہوارۂ امن بنانے اور وہاں پھلوں کی بہتات کرنے کی دعا کی تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اپنی نعمتوں سے صرف ان لوگوں کو نواز جو تجھ پر ایمان لائیں

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ

(یاد کرو اس وقت کو) جب ابراہیم نے دعا کی اے میرے رب اس شہر کو امن کا شہر بنا دے اور اس کے باشندوں میں سے جو اللہ اور آخرت کو مانیں

الْاٰخِرِ (البقرہ: ۱۲۶) ہر قسم کے پھلوں کا رزق دے۔

قرآن کریم نے حضرت ابراہیمؑ کی صفتِ ایمان کو واضح کرنے کے لیے متعدد الفاظ اور تعبیریں استعمال کی ہیں۔ ایک جگہ ہے:

اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ (الصافات ۱۱۱) یقیناً وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔

دوسری جگہ ارشاد باری ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ (الانبیاء — ۵۱) اس سے بھی پہلے ہم نے ابراہیم کو اس کی ہوشمندی بخشی تھی۔

ایک جگہ قرآن آپ کو 'قلب سلیم' کا حامل قرار دیتا ہے:

وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ (الصافات ۸۳) اور نوحؑ کے طریقے پر چلنے والا ابراہیم تھا جب وہ اپنے رب کے حضور قلب سلیم لے کر آیا۔

ابن عباسؓ، مجاہد، محمد بن سیرین وغیرہ نے سلیم کا مطلب شرک سے محفوظ بتلایا ہے[۲۵] قرآن نے آپ کی ایک صفت 'حنیف' کا متعدد مقامات پر تذکرہ کیا ہے۔

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا وَّلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (النحل - ۱۲۰) بیشک ابراہیم اپنی ذات سے ایک پوری امت تھا اللہ کا مطیع فرمان اور یکسو۔ وہ کبھی مشرک نہ تھا۔

كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (آل عمران - ۶۷) وہ تو ایک مسلم حنیف تھا اور وہ ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھا۔

حنیف دراصل اس شخص کو کہتے ہیں جو شرک سے بالقصد اعراض کرکے اور اسے علی وجہ البصیرت ترک کرکے حق کی طرف رجوع ہو۔ اس طور پر کہ اسے کوئی چیز حق قبول کرنے سے باز نہ رکھ سکے[۲۶] اس کا استعمال شرک کے بالمقابل ہوا ہے چنانچہ قرآن نے جہاں جہاں حنیف کا لفظ استعمال کیا ہے وہاں اس کے ساتھ شرک کی نفی ضرور کی ہے قرآن نے صحف ابراہیمی کا جو حوالہ دیا ہے اس میں بھی توحید پر بہت زور دیا گیا ہے سورۂ نجم میں ہے:

اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِيْ صُحُفِ مُوْسٰى ۙ وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰٓى ۝ کیا اسے ان باتوں کی کوئی خبر نہیں پہنچی جو موسیٰ کے صحیفوں اور اس ابراہیم کے صحیفوں

..... وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى ○	میں بیان ہوئی ہیں جس نے وفا کا حق
وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْيَا ○ وَ	ادا کر دیا..... یہ کہ اسی نے ہنسایا اور اسی
اَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ	نے رلایا اور یہ کہ اسی نے موت دی اور
وَالْاُنْثٰى ○ مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى ○	اسی نے زندگی بخشی اور یہ کہ اسی نے نر اور
وَاَنَّ عَلَيْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى ○	مادہ کا جوڑا پیدا کیا ایک بوند سے جب وہ
وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَاَقْنٰى ○ وَاَنَّهٗ	ٹپکائی جاتی ہے اور یہ کہ دوسری زندگی بخشنا
هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى ○	بھی اسی کے ذمہ ہے اور یہ کہ اس نے
(النجم: ۳۶ - ۴۹)	غنی کیا اور جائداد بخشی اور یہ کہ وہی شعریٰ
	کا رب ہے۔

ملت ابراہیمی میں توحید کی اہمیت اور اس کے اعلیٰ مقام کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جیل کے ساتھیوں کے سامنے جب حق کی دعوت پیش کی تو شرک کے معائب اور نقائص بیان کرتے ہوئے اس کے بالمقابل ملت ابراہیمی کا حوالہ دیا اور عقلی انداز میں ان کے سامنے عقیدۂ توحید پیش کیا:

اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ	میں نے ان لوگوں کا طریقہ چھوڑ کر جو اللہ
بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ	پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کا انکار
كٰفِرُوْنَ ○ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ	کرتے ہیں اپنے بزرگوں ابراہیم، اسحاق
اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَ	اور یعقوب کی ملت کی پیروی کی ہے، ہمارا
يَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ	یہ کام نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو
بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ	شریک ٹھہرائیں۔ درحقیقت یہ اللہ کا فضل
فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ	ہے ہم پر اور تمام انسانوں پر (کہ اس نے
وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ○	اپنے سوا کسی کا بندہ ہمیں نہیں بنایا) مگر
يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ	اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ اے زنداں کے
مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ	ساتھیو! تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق
الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ○ مَا تَعْبُدُوْنَ	رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب
مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ	پر غالب ہے؟ اس کو چھوڑ کر تم جن

اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

(یوسف : ۳۷-۴۰)

کی بندگی کر رہے ہو وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباء و اجداد نے رکھ لیے ہیں اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی۔ فرماں روائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو یہی ٹھیٹھ سیدھا طریقِ زندگی ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

توریت میں بھی حضرت ابراہیم کے ایمان کی تصدیق کی گئی ہے۔ کتاب پیدائش میں ہے:

"اور وہ خدا پر ایمان لایا اور اسے اس نے اس کے حق میں راستبازی شمار کیا۔"[۲۷]

اناجیل میں بھی اس جملہ کو متعدد مقامات پر دہرایا گیا ہے اور اس کی تشریح کی گئی ہے (اگرچہ ان مقامات پر ایمان کو شریعت کے بالمقابل ایک اصطلاح کے طور پر استعمال کیا گیا ہے) مثلاً ایک جگہ ہے:

"ایمان ہی کے سبب سے ابرہام جب بلایا گیا تو حکم مان کر اس جگہ چلا گیا جسے میراث میں لینے والا تھا..... ایمان ہی سے اس نے ملک موعود میں اس طرح مسافرانہ طور پر بود و باش اختیار کی کہ گویا غیر ملک ہے..... ایمان ہی سے ابرہام نے آزمائش کے وقت اضحاق کو نذر گزرانا"[۲۸]

۲۔ رسالت

حضرت ابراہیم کی تعلیمات میں رسالت کا بہت واضح تصور موجود ہے۔ آپ اپنے باپ اور قوم کو دعوت دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ پیغمبر اللہ تعالیٰ کا فرستادہ ہوتا ہے۔ اسے کچھ خصوصی علم سے نوازا جاتا ہے جس سے دوسرے لوگ محروم ہوتے ہیں۔ اس لیے ہدایت سے فیض یاب ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو احکام نبی لے کر آئے انھیں قبول کر کے ان پر عمل کیا جائے اور نبی کی پیروی کی جائے۔ آپ نے بعثت کے بعد جب اپنے

باپ کو راہِ حق کی دعوت دی اور اس کے سامنے بت پرستی کے نقائص و معائب واضح کیے تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا:

يَا أَبَتِ إِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ	ابا جان میرے پاس ایک ایسا علم آیا ہے
الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِي	جو آپ کے پاس نہیں آیا۔ آپ میرے پیچھے
أَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۝ (مریم: ۴۳)	چلیں، میں آپ کو سیدھا راستہ بتاؤں گا۔

نبی جب دعوت دیتا ہے اور مخاطبین کو ہدایت کی طرف بلاتا ہے تو وہ اپنی دعوت پر گواہ بھی ہوتا ہے۔ وہ اعلان کرتا ہے کہ عبادت کے لائق صرف ایک ہی ذات ہے جس نے سب کو پیدا کیا ہے اور جو سب کو روزی بہم پہنچا رہا ہے حضرت ابراہیم نے جب اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی اور بت پرستی پر کاری ضرب لگائی تو وہ بوکھلا گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ ابراہیم یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں چنانچہ اس نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ سنجیدہ باتیں ہیں یا محض کوئی کھیل تماشہ ہے؟ اس پر حضرت ابراہیم نے جواب دیا:

قَالَ بَل رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ	اس نے جواب دیا نہیں بلکہ فی الواقع
الَّذِي فَطَرَهُنَّ وَأَنَا عَلَىٰ	تمہارا رب وہی ہے جو زمین اور آسمانوں
ذٰلِكُم مِّنَ الشّٰهِدِينَ ۝	کا رب اور ان کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس
(الانبیاء: ۵۶)	پر میں تمہارے سامنے گواہی دیتا ہوں۔

لیکن نبی کسی کو ہدایت قبول کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ اس کا کام بس یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ذمہ تبلیغ وحی کا جو فریضہ عائد کیا ہے اسے بے کم و کاست پہنچا دے۔ اب اگر کوئی شخص ایمان لاتا ہے تو خود اسی کا فائدہ ہے اور اگر کوئی انکار کرتا ہے تو اس کی سزا اسی کو بھگتنا ہوگی۔ چنانچہ حضرت ابراہیم نے اپنی قوم کو جب توحید، عبادت الٰہی اور تقویٰ کے فائدے اور شرک اور بت پرستی کے نقصانات بتلائے تو ساتھ ہی اس سے بھی خبردار کیا:

وَإِن تُكَذِّبُوا فَقَدْ كَذَّبَ أُمَمٌ	اور اگر تم جھٹلاتے ہو تو تم سے پہلے بہت
مِّن قَبْلِكُمْ ۖ وَمَا عَلَى الرَّسُولِ	سی قومیں جھٹلا چکی ہیں اور رسول پر صاف
إِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِينُ ۝	صاف پیغام پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری
(العنکبوت: ۱۸)	نہیں ہے۔

۳۔ آخرت

آخرت پر ایمان ملتِ ابراہیمی کے اہم عناصر میں سے ہے۔ عموماً اس کا ذکر دعوتِ ابراہیمی میں ایمان باللہ اور ایمان بالرسالہ کے ساتھ آتا ہے۔ بعثت کے بعد اپنے باپ کو دعوت دیتے ہوئے انتہائی نرمی اور دلسوزی کے ساتھ جہاں حضرت ابراہیم نے اللہ پر ایمان لانے اور انھیں اس کا پیغمبر ماننے کی دعوت دی، وہیں ساتھ ہی یہ بھی فرمایا:

يَآ اَبَتِ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ	ابا جان مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ رحمٰن کے
عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ	عذاب میں مبتلا نہ ہو جائیں اور شیطان کے
لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ۝ (مریم: ۴۵)	ساتھی بن کر رہیں۔

اپنے باپ اور اپنی قوم کو دعوت دیتے ہوئے انھیں شرک کے انجام سے ڈراتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر انھوں نے بت پرستی ترک نہ کی تو انھیں آخرت میں اپنے انجام سے ڈرنا چاہیے جب اللہ تعالیٰ انھیں اس کی سزا دے گا اور عذاب میں مبتلا کرے گا:

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَاذَا	جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم
تَعْبُدُوْنَ ۝ اَئِفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ	سے کہا: یہ کیا چیزیں ہیں جن کی تم عبادت
اللّٰهِ تُرِيْدُوْنَ ۝ فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ	کر رہے ہو؟ کیا اللہ کو چھوڑ کر جھوٹ گھڑے
الْعٰلَمِيْنَ ۝	ہوئے معبود چاہتے ہو؟ آخر رب العالمین
(الصافات: ۸۵-۸۷)	کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے؟

اپنے عقیدہ کی وضاحت کرتے ہوئے اللہ اور اس کی صفات پر ایمان کے ساتھ ساتھ آخرت پر ایمان کا بھی تذکرہ کرتے ہیں:

فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ	میرے تو یہ سب دشمن ہیں۔ بجز ایک
..... وَالَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ	رب العالمین کے ..... جس سے میں امید
خَطِيْٓـَٔتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ	رکھتا ہوں کہ روز جزا میں وہ میری خطا
(الشعرا: ۷۷-۸۲)	معاف فرما دے گا۔

اپنی قوم کو بت پرستی کے انجام سے باخبر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ	تم نے دنیا کی زندگی میں تو اللہ کو چھوڑ کر

اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ	بتوں کو اپنے درمیان محبت کا ذریعہ بنا
الدُّنْيَا ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ	لیا ہے مگر قیامت کے روز تم ایک
بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ	دوسرے کا انکار اور ایک دوسرے پر
بَعْضًا وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ	لعنت کرو گے اور آگ تمہارا ٹھکانہ ہوگی
مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝ (العنکبوت: ۲۵)	اور کوئی تمہارا مددگار نہ ہوگا۔

مزید فرماتے ہیں:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ	درحقیقت اللہ کے سوا جن کی تم پرستش
اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا	کرتے ہو وہ تمہیں کوئی رزق بھی دینے کا
فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ	اختیار نہیں رکھتے۔ اللہ سے رزق مانگو اور
وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ۭ اِلَيْهِ	اسی کی بندگی کرو اور اس کا شکر ادا کرو۔
تُرْجَعُوْنَ ۝ (العنکبوت: ۱۷)	اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو

حضرت ابراہیمؑ نے جب بارگاہ ایزدی میں دعا کی کہ اس بے آب وگیاہ وادی کو پرامن شہر بنا دے اور یہاں رہنے والوں کو پھلوں کی روزی عطا فرما تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اپنی ان نعمتوں سے صرف انھیں لوگوں کو بہرہ ور فرما جو تجھ پر ایمان لائیں اور ساتھ ہی آخرت پر ایمان رکھیں:

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ	یاد کرو وہ وقت جب ابراہیمؑ نے دعا
هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ	کی اے میرے رب اس کو امن کا شہر
اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ	بنا دے اور اس کے باشندوں میں
بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ	سے جو اللہ اور آخرت کو مانیں انھیں
(البقرہ: ۱۲۶)	ہر قسم کے پھلوں کا رزق دے۔

آخرت کا تصور صحف ابراہیمی کی ان تعلیمات میں بھی ملتا ہے جن کا قرآن نے حوالہ دیا ہے:

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝	مگر تم لوگ، دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو
وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝	حالانکہ آخرت بہتر ہے اور باقی رہنے والی
اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۝	ہے۔ یہی بات پہلے آئے ہوئے صحیفوں
صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ۝	میں بھی کہی گئی تھی۔ ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کے
(الاعلیٰ: ۱۶-۱۹)	صحیفوں میں۔

اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِيْ صُحُفِ مُوْسٰى ۝	کیا اسے ان باتوں کی کوئی خبر نہیں پہنچی
وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰٓى ۝	جو موسیٰ کے صحیفوں اور اس ابراہیم
وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ۝	کے صحیفوں میں بیان ہوئی ہیں جس نے
وَاَنَّ عَلَيْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى ۝	وفا کا حق ادا کر دیا..... یہ کہ آخر کار پہنچنا
(النجم: ۳۶ - ۴۲)	تیرے رب ہی کے پاس ہے .....اور
	یہ کہ دوسری زندگی بخشنا بھی اسی کے ذمہ ہے۔

یہی نہیں بلکہ صحف ابراہیم میں تصور آخرت کے ساتھ جزا و سزا کی بھی صراحت ملتی ہے:

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝	اور یہ کہ انسان کے لیے کچھ نہیں ہے مگر
وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ۝	وہ جس کی اس نے سعی کی ہے اور یہ کہ
ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ۝	اس کی سعی عنقریب دیکھی جائے گی پھر
(النجم: ۳۹-۴۱)	اس کی پوری جزا اسے دی جائے گی۔

۴۔ اطاعت اور سرافگندگی

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پوری زندگی نگاہوں کے سامنے ہو تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے خود کو پورے طور پر اللہ تعالیٰ کی مرضی کے حوالے کر دیا تھا۔ اس کے ارشادات و احکام پر عمل پیرا ہونے کے لیے آپ ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ قرآن کے ساتھ توریت میں بھی آپ کی اطاعت الٰہی کا بارہا تذکرہ کیا گیا ہے۔

جب تک آپ کو اللہ تعالیٰ نے وطن میں رہ کر دعوت دینے کا حکم دیا آپ سخت سے سخت حالات کی پروا کیے بغیر فریضۂ دعوت ادا کرتے رہے۔ پھر جب اس نے آپ کو ہجرت کرنے کا حکم دیا تو آپ نے اس حکم کے آگے بھی سر تسلیم خم کر دیا، توریت میں ہے:

"خداوند نے ابرام سے کہا کہ تو اپنے وطن اور اپنے ناتے داروں کے بیچ سے اور اپنے باپ کے گھر سے نکل کر اس ملک میں جا، جو میں تجھے دکھاؤں گا .....سو ابرام خدا کے کہنے کے مطابق چل پڑا"[۲۹]

انجیل برناباس میں ہے کہ حضرت عیسیٰ نے کاہنوں سے فرمایا:

"میں تمہارے خلاف پکار کر کہتا ہوں کہ تم شیطان کی اولاد ہو نہ کہ ابرہام کی جس نے

خدا کی محبت میں اپنے باپ کا گھر چھوڑ دیا اور اپنے بیٹے کو ذبح کرنے پر تیار ہو گیا"[۳۱]

قرآن کہتا ہے:

وَقَالَ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ — اور ابراہیم نے کہا میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہوں۔ (العنکبوت: ۲۶)

"خدا کے کہنے کے مطابق"، "خدا کی محبت میں" اور "رب کی طرف ہجرت" کے الفاظ سے آپ کی کامل اطاعتِ الٰہی کی پوری طرح وضاحت ہوتی ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کی آزمائش کرتے ہوئے اکلوتے بیٹے کی قربانی کا حکم دیا تو بلا ادنیٰ تأمل اس پر بھی تیار ہو گئے اور ٹھیک ٹھیک اس کے حکم کے مطابق عمل کر دکھایا، توریت میں ہے:

"ابرہام نے ہاتھ بڑھا کر چھری لی کہ اپنے بیٹے کو ذبح کرے۔ تب خداوند کے فرشتے نے اسے آسمان سے پکارا کہ اے ابرہام اے ابرہام اس نے کہا میں حاضر ہوں۔ پھر اس نے کہا کہ تو اپنا ہاتھ لڑکے پر نہ چلا اور نہ اس سے کچھ کر کیوں کہ میں اب جان گیا کہ تو خدا سے ڈرتا ہے"[۳۲]

"تو خدا سے ڈرتا ہے" کے الفاظ سے واضح اشارہ ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی اطاعت و خود سپردگی پر مہرِ تصدیق ثبت فرما دی۔ خود توریت نے اس واقعۂ قربانی کو سراسر اطاعت قرار دیا ہے:

"خداوند فرماتا ہے چونکہ تو نے یہ کام کیا کہ اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے دریغ نہ رکھا اس لیے میں نے بھی اپنی ذات کی قسم کھائی ہے کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا..... کیونکہ تو نے میری بات مانی"[۳۳]

قرآن کریم نے اس سلسلہ میں بڑی خوبصورت تعبیر اختیار کی ہے:

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ وَنَادَیْنٰهُ اَنْ یّٰۤاِبْرٰهِیْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْیَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ (الصافات: ۱۰۳-۱۰۵)

آخر کو جب ان دونوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور ابراہیم نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دیا اور ہم نے ندا دی کہ اے ابراہیم تو نے خواب سچ کر دکھایا۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔

"اسلام" کے معنی اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت، خود سپردگی و سرافگندگی اور نفس کو مرضیٔ الٰہی

کے تابع کرنا ہے قرآن نے اسے ملت ابراہیمی کا ایک اہم رکن قرار دیا ہے اور بتلایا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم سے خود سپردگی اور اطاعت کامل کا مطالبہ کیا تو انھوں نے بلا تأمل سر تسلیم خم کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ اپنی اولاد کو بھی اسی کی وصیت کی:

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ۭ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ۭ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝

(البقرہ: ۱۳۰-۱۳۲)

اب کون ہے جو ابراہیم کی ملت کو ناپسند کرے، جس نے خود اپنے آپ کو حماقت وجہالت میں مبتلا کر لیا ہو اس کے سوا کون یہ حرکت کر سکتا ہے۔ ابراہیم تو وہ شخص ہے جس کو ہم نے دنیا میں اپنے کام کے لیے چن لیا تھا اور آخرت میں اس کا شمار صالحین میں ہوگا۔ اس کا حال یہ تھا کہ جب اس کے رب نے اس سے کہا مسلم ہو جا تو اس نے فوراً کہا میں مالک کائنات کا مسلم ہو گیا۔ اسی ملت پر چلنے کی ہدایت اس نے اپنی اولاد کو کی تھی اور اسی کی وصیت یعقوب اپنی اولاد کو کر گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ میرے بچو اللہ نے تمہارے لیے یہی دین پسند کیا ہے لہٰذا مرتے دم تک مسلم ہی رہنا۔

یہی نہیں بلکہ ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی دعا کی کہ ان کی نسل میں ایک ایسی امت برپا کرے جو پوری طرح اس کی وفادار ہو اور جو اپنے آپ کو اس کی مرضی کے تابع کر دے:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ (البقرہ۔ ۱۲۸)

اے رب ہم دونوں کو اپنا مسلم (مطیع فرمان) بنا دو ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا جو تیری مسلم ہو۔

توریت میں بھی اس قسم کے مضامین موجود ہیں:

"خداوند ابرام کو نظر آیا اور اس سے کہا کہ میں خدای قادر ہوں تو میرے

حضور چل اور کامل ہو اور میں اپنے اور تیرے درمیان عہد باندھوں گا اور تجھے بہت زیادہ بڑھاؤں گا۔ تب ابرام سرنگوں ہو گیا"[۳۳]

"خداوند نے کہا کہ جو کچھ میں کرنے کو ہوں کیا اسے ابرہام سے پوشیدہ رکھوں۔ ابرہام سے تو ایک بڑی اور زبردست قوم پیدا ہو گی اور زمین کی سب قومیں اس کے وسیلہ سے برکت پائیں گی کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وہ اپنے بیٹوں اور گھرانے کو جو اس کے پیچھے رہ جائیں گے وصیت کرے گا کہ وہ خداوند کی راہ میں قائم رہ کر عدل و انصاف کریں"[۳۴]

کتاب نحمیاہ میں ہے:

یشوع اور قدمی ایل اور بانی اور حسنیاہ اور سربیاہ اور یہودیاہ اور فتحیاہ لاویوں نے کہا: کھڑے ہو جاؤ اور کہو: خداوند ہمارا خدا ازل سے ابد تک مبارک ہے ..... تو وہ خداوند خدا ہے جس نے ابرام کو چن لیا اور اسے کسدیوں کے اور سے نکال لایا اور اس کا نام ابرہام رکھا، تو نے اس کا دل اپنے حضور وفادار پایا"[۳۵]

قرآن کریم نے متعدد مقامات پر سیرت ابراہیمی کے مختلف پہلوؤں کو آشکارا کرتے ہوئے اطاعت الٰہی کو خوب نمایاں کیا ہے:

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ (ہود: ۷۵)	حقیقت میں ابراہیم بڑا حلیم اور نرم دل آدمی تھا اور ہر حال میں ہماری طرف رجوع کرتا تھا۔
اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (النحل: ۱۲۰)	بیشک ابراہیم اپنی ذات سے ایک پوری امت تھا۔ اللہ کا مطیع فرمان اور حنیف۔ وہ کبھی مشرک نہ تھا۔

حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ قانت کے معنی اطاعت کرنے والا ہے[۳۶]

مولانا فراہیؒ نے اصول تاویل کی بنیاد پر اور اشعار جاہلیت سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امت کے معنی اس آیت میں اطاعت گزار کے ہیں[۳۷]

۵۔ نماز

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی میں نماز کو بھی اہم مقام حاصل ہے۔ توریت میں

اس کے لیے بعض مواقع پر "سرنگوں ہونے" اور بعض جگہ "دعا کرنے" کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔

"اور خدا نے ابراہام سے کہا کہ ساری جو تیری بیوی ہے اس کو ساری نہ پکارنا اس کا نام سارہ ہوگا اور میں اسے برکت دوں گا اور اس سے تجھے ایک بیٹا بخشوں گا یقیناً میں اسے برکت دوں گا اور قومیں اس کی نسل سے ہوں گی اور عالم کے بادشاہ اس سے پیدا ہوں گے۔ تب ابراہام سرنگوں ہوا۔"[۳۸]

"خداوند ابرام کو نظر آیا اور اس سے کہا کہ میں خدای قادر ہوں۔ تو میرے حضور چل اور کامل ہو اور میں اپنے اور تیرے درمیان عہد باندھوں گا اور تجھے بہت زیادہ بڑھاؤں گا۔ تب ابرام سرنگوں ہو گیا۔"[۳۹]

"تب ابرہام نے بیر سبع میں جھاؤ کا ایک درخت لگایا اور وہاں اس نے خدا سے جو ابدی خدا ہے دعا کی۔"[۴۰]

قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا مذکور ہے کہ مجھے اور میری نسل کو نماز قائم کرنے والا بنا دے:

رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوۃِ	پروردگار مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور
وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاءِ	میری اولاد سے بھی (ایسے لوگ اٹھا جو
(ابراہیم - ۴۰)	یہ کام کریں) پروردگار میری دعا قبول کر۔

مکہ کی بے آب وگیاہ وادی میں حضرت اسماعیل کو آباد کرتے وقت بھی حضرت ابراہیم نے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہوئے اپنی نسل کو وہاں آباد کرنے کا مقصد یہی بتلایا تھا کہ وہاں رہ کر وہ نماز قائم کریں:

رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ	پروردگار میں نے ایک بے آب وگیاہ
بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ	وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو
بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا	تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے۔
الصَّلٰوۃَ	پروردگار یہ میں نے اس لیے کیا ہے کہ
(ابراہیم: ۳۷)	یہ لوگ یہاں نماز قائم کریں۔

پھر جب حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل نے مل کر خانہ کعبہ کی تعمیر کی اس وقت اللہ تعالیٰ نے انھیں حکم دیا کہ طواف وعبادت کی غرض سے آنے والوں کے لیے اس کی طہارت کا

اہتمام کریں :

وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝ (البقرہ : ۱۲۵)	ہم نے ابراہیم اور اسماعیل کو تاکید کی تھی کہ میرے اس گھر کو طواف اور اعتکاف اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔
وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِىْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝ (الحج : ۲۶)	یاد کرو وہ وقت جب ہم نے ابراہیم کے لیے اس گھر (خانہ کعبہ) کی جگہ تجویز کی تھی (اس ہدایت کے ساتھ) کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام و رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت ابراہیمی میں نماز کو نہ صرف بنیادی اہمیت حاصل تھی بلکہ نماز کے ارکان میں قیام رکوع اور سجود بھی شامل تھے۔

قرآن نے صحف ابراہیم کی جن تعلیمات کا حوالہ دیا ہے ان میں نماز بھی ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ..... اِنَّ هٰذَا لَفِى الصُّحُفِ الْاُوْلٰى صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ۝ (الاعلیٰ : ۱۴ — ۱۹)	فلاح پا گیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی اور اپنے رب کا نام یاد کیا اور پھر نماز پڑھی..... یہی بات پہلے آئے ہوئے صحیفوں میں بھی کہی گئی تھی ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔

چنانچہ قرآن نے اہل ایمان کو رکوع و سجود کرنے، نماز قائم کرنے اور عبادت کرنے کا حکم دیا تو ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا کہ یہ تمہارے باپ ابراہیم کی ملت کے ارکان ہیں :

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى (البقرہ: ۱۲۵)	(اور لوگوں کو حکم دیا تھا کہ) ابراہیم جہاں عبادت کے لیے کھڑا ہوتا ہے اس مقام کو مستقل جائے نماز بنا لو۔
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا	اے لوگو جو ایمان لائے ہو رکوع اور

وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۭ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۭ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ (الحج: ۷۷-۷۸)

سجدہ کرو۔ اپنے رب کی بندگی کرو اور نیک کام کرو۔ اسی سے توقع کی جاسکتی ہے کہ تم کو فلاح نصیب ہو۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے اس نے تمہیں اپنے کام کے لیے چن لیا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ قائم ہو جاؤ اپنے باپ ابراہیم کی ملت پر۔

۶۔ قربانی

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیات طیبہ میں قربانی کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ توریت میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم سفر کرتے ہوئے جہاں بھی پڑاؤ ڈالتے تھے وہاں خدا سے دعا کرتے تھے اور قربان گاہ بناتے تھے۔ دعا کرنے سے عبادتِ الٰہی یعنی نماز اور قربان گاہ بنانے سے قربانی کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں کتاب پیدائش میں حضرت ابراہیمؑ کے کئی ایک مقامات پر قربان گاہ بنانے کا تذکرہ ملتا ہے:

۱۔ "ابرام مقام سکم میں مورہ کے بلوط تک پہنچا۔ اس وقت ملک میں کنعانی رہتے تھے۔ تب خداوند نے ابرام کو دکھائی دے کر کہا کہ یہی ملک میں تیری نسل کو دوں گا اور اس نے وہاں خداوند کے لیے جو اسے دکھائی دیا تھا ایک قربان گاہ بنائی" ۱۲:۶

۲۔ "اور وہاں سے کوچ کر کے اس پہاڑی کی طرف گیا جو بیت ایل کے مشرق میں ہے اور اپنا ڈیرہ ایسے لگایا کہ بیت ایل مغرب میں اور عی مشرق میں پڑا اور وہاں اس نے خداوند کے لیے ایک قربان گاہ بنائی اور خداوند سے دعا کی۔" ۱۲:۸

(مصر سے واپسی پر) "کنعان کے جنوب سے سفر کرتا ہوا بیت ایل میں اس جگہ پہنچا جہاں پہلے بیت ایل اور عی کے درمیان اس کا ڈیرہ تھا یعنی وہ مقام

جہاں اس نے شروع میں قربان گاہ بنائی تھی اور وہاں ابرام نے خداوند سے دعا کی" [۴۳]

۳۔ "ابرام نے اپنا ڈیرہ اٹھایا اور ممرے کے بلوطوں میں جو حبرون میں ہیں جا کر رہنے لگا اور وہاں خداوند کے لیے ایک قربان گاہ بنائی" [۴۴]

قرآن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حج کا اعلانِ عام کرنے کا حکم دیا تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا :

لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا	تاکہ وہ لوگ وہ فائدے دیکھیں جو یہاں
اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ	ان کے لیے رکھے گئے ہیں اور چند مقررہ
عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ	دنوں میں ان جانوروں پر اللہ کا نام لیں
فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ	جو اس نے انھیں بخشے ہیں خود بھی کھائیں
الْفَقِيرَ ۝ (الحج: ۲۸)	اور تنگ دست محتاج کو بھی دیں۔

آخر میں اللہ تعالیٰ نے آپ کی ایک بہت بڑی آزمائش کی۔ اور وہ یہ کہ آپ کو حکم دیا کہ اپنے اکلوتے بیٹے کو میری راہ میں قربان کر دو۔ یہ ایک شدید آزمائش تھی لیکن عاشق صادق اس میں بھی کامیاب ہو گیا اور بے چون و چرا ارشاد الٰہی کی تعمیل میں مصروف ہو گیا۔ بالآخر ندائے غیبی آئی کہ مقصود صرف آزمائش تھی اس لیے اب ہاتھ روک لو۔ توریت میں واقعۂ ذبح کا تفصیلی بیان موجود ہے [۴۵] قرآن نے بھی اس کا تذکرہ کرتے ہوئے اسے رہتی دنیا تک کے لیے یادگار قرار دیے جانے کا تذکرہ کیا ہے :

فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ	جب ان دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا
وَنَادَيْنَاهُ أَن يَا إِبْرَاهِيمُ قَدْ	اور ابراہیم نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دیا
صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي	اور ہم نے ندا دی کہ اے ابراہیم تو نے خواب
الْمُحْسِنِينَ، إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ	سچ کر دکھایا۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی
الْمُبِينُ، وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ	جزا دیتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش
(الصافات: ۱۰۳-۱۰۷)	تھی اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیہ میں
	دے کر اس بچے کو چھڑا لیا۔

توریت سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت آدمؑ کی طرح شریعت ابراہیمی میں بھی پہلوٹھے

کی قربانی کی جاتی تھی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو پہلوٹھے بیٹے کی قربانی کا حکم دیا تھا۔

۷۔ حج

شریعت ابراہیمی کا ایک اہم رکن حج ہے۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے مل کر اللہ تعالیٰ کی بتلائی ہوئی جگہ خانہ کعبہ کی تعمیر کی اور دعا کی کہ وہ انھیں ادائیگیٔ مناسک کا طریقہ بتلادے:

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ	اور یاد کرو۔ ابراہیم اور اسماعیل جب اس
مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ۚ رَبَّنَا	گھر کی دیواریں اٹھا رہے تھے (تو دعا کرتے
تَقَبَّلْ مِنَّا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ	جاتے تھے) اے ہمارے رب ہم سے یہ
الْعَلِيْمُ ۝ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ	خدمت قبول فرمالے۔ تو سب کی سننے
لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً	اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ اے رب
مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا	ہم دونوں کو اپنا مسلم (مطیع فرمان) بنا ہماری
وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ	نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا جو تیری مسلم
الرَّحِيْمُ ۝	ہو۔ ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا اور
(البقرہ: ۱۲۷-۱۲۸)	ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما تو بڑا معاف
	کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا کو شرف قبولیت سے نوازا اور مناسک حج بتلائے۔ ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا کہ وہ لوگوں میں حج کا اعلان کر دیں تاکہ ان کے ماننے والے دنیا کے کونے کونے سے کھنچ کر بیت اللہ کی زیارت کو آئیں اور مناسک حج ادا کریں۔

وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ	اور لوگوں کو حج کے لیے اذنِ عام دیدو
رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ	کہ وہ تمہارے پاس ہر دور دراز مقام سے
فَجٍّ عَمِيْقٍ ۝ (الحج: ۲۷)	پیدل اور اونٹوں پر سوار آئیں۔

توریت میں خانۂ کعبہ اور حج کا کوئی تذکرہ نہیں ہے اس لیے کہ اس میں حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ حضرت اسماعیلؑ کا تذکرہ بھی لازم آتا ہے۔ چنانچہ یہود نے تحریف سے کام لے کر

وہ تمام تصریحات حذف کر دیں جن سے خانۂ کعبہ کی تعمیر اور حج کی فرضیت معلوم ہوتی تھی۔ اس کے باوجود اب بھی موجودہ توریت میں بہت سے اشارات ملتے ہیں۔ آئندہ دوسرے مقالے میں ہم اس پر تفصیل سے بحث کریں گے۔

۸۔ ختنہ

ملت ابراہیمی کا ایک شعار ختنہ ہے۔ توریت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم سے کثرتِ ذریت کا وعدہ کیا اور یہ عہد لیا کہ اگر ان کی نسل توحید پر قائم رہی تو انھیں زمین پر اقتدار عطا کرے گا۔ اس عہد کو یاد دلاتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ختنہ کو اس کی علامت قرار دیا:

"پھر خدا نے ابرہام سے کہا کہ تو میرے عہد کو ماننا اور تیرے بعد تیری نسل پشت در پشت اسے مانے اور میرا عہد جو میرے اور تیرے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ہے اور جسے تم مانو گے سو یہ ہے کہ تم میں سے ہر فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جائے اور تم اپنے بدن کی کھلڑی کا ختنہ کیا کرنا اور یہ اس عہد کا نشان ہوگا جو میرے اور تمہارے درمیان ہے"[۴۹]

ملت ابراہیمی میں ختنہ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاتا ہے کہ توریت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے حکم دیا:

"اور وہ فرزند نرینہ جس کا ختنہ نہ ہوا ہو اپنے لوگوں میں سے کاٹ ڈالا جائے کیونکہ اس نے میرا عہد توڑا"[۵۰]

چنانچہ یہ حکم ملتے ہی حضرت ابراہیم نے گھر کے سب لوگوں کو جمع کیا اور اسی روز خدا کے حکم کے مطابق ان کا ختنہ کیا۔ ان میں حضرت اسماعیل بھی تھے۔ اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ننانوے سال اور حضرت اسماعیل کی تیرہ سال تھی[۵۱]۔ پھر اگلے سال جب حضرت اسحاق کی ولادت ہوئی تو حضرت ابراہیم نے ان کا بھی ختنہ کیا[۵۲]

حدیث میں بھی حضرت ابراہیم کے ختنہ کرنے کا تذکرہ ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اختتن ابراھیم وھو ابن	حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی سال
ثمانین سنۃ بالقدوم[۵۳]	کی عمر میں قدوم (ایک اوزار) سے ختنہ کیا۔

موطأ میں حضرت ابوہریرہ سے موقوفاً اور ابن حبان میں مرفوعاً مروی ہے کہ اس وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر ایک سو بیس سال تھی ابن حجر نے فتح الباری میں دونوں قسم کی روایتوں میں تطبیق کی کوشش کی ہے[۵۲]۔ بہرحال ختنہ کے وقت حضرت ابراہیم کی عمر کچھ بھی رہی ہو مگر اس کا ثبوت توریت اور حدیث دونوں میں موجود ہے۔

۹۔ اکرامِ ضیف

سیرت ابراہیمی سے بنیادی عقائد اور عبادات کے ساتھ ساتھ حقوق العباد کی اہمیت کا بھی پتہ چلتا ہے چنانچہ توریت اور قرآن دونوں نے حضرت ابراہیم کی مہمان نوازی کا خاص طور پر تذکرہ کیا ہے۔ توریت میں ہے کہ حضرت ابراہیم نے تین مردوں کو اپنے خیمہ کے قریب دیکھا تو ان سے ملنے کے لیے دوڑے اور فرمایا:

"اے میرے خداوند اگر مجھ پر آپ نے کرم کی نظر کی ہے تو اپنے خادم کے پاس سے چلے نہ جائیں بلکہ تھوڑا سا پانی لایا جائے اور آپ اپنے پاؤں دھوکر اس درخت کے نیچے آرام کریں میں کچھ روٹی لاتا ہوں، آپ تازہ دم ہو جائیں تب آگے بڑھیں کیوں کہ آپ اسی لیے اپنے خادم کے ہاں آئے ہیں انھوں نے کہا جیسا تو نے کہا ہے ویسا ہی کر۔ اور ابرہام ڈیرے میں سارہ کے پاس دوڑا گیا اور کہا کہ تین پیمانہ باریک آٹا جلد لے اور اسے گوندھ کر پھلکے بنا اور ابرہام گلہ کی طرف دوڑا گیا اور ایک موٹا تازہ بچھڑا لاکر ایک جوان کو دیا اور اس نے جلدی جلدی اسے تیار کیا پھر اس نے مکھن اور دودھ اور اس بچھڑے کو جو اس نے پکوایا تھا لے کر ان کے سامنے رکھا اور آپ ان کے پاس درخت کے نیچے کھڑا رہا"[۵۳]

قرآن نے کئی مقامات پر اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے[۵۴]۔ سورۂ الذاریات میں ہے:

هَلْ اَتَاكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ	اے نبی! ابراہیم کے معزز مہمانوں کی حکایت
الْمُكْرَمِيْنَ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا	بھی تمہیں پہنچی ہے جب وہ اس کے ہاں
سَلٰمًا قَالَ سَلٰمٌ، قَوْمٌ	آئے تو کہا آپ کو سلام ہے اس نے کہا
مُّنْكَرُوْنَ، فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ	آپ لوگوں کو بھی سلام ہے، کچھ نا آشنا سے

فَجَاءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ فَقَرَّبَهٗ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ؟ (الذاریات: ۲۴-۲۷)

لوگ ہیں۔ پھر وہ چپکے سے اپنے گھر والوں کے پاس گیا اور ایک (بھنا ہوا) موٹا تازہ بچھڑا لاکر مہمانوں کے آگے پیش کیا۔ اس نے کہا آپ حضرات کھاتے نہیں؟

قرآن کریم نے ان آیات میں بہت خوبصورتی سے مہمان نوازی کے آداب بھی بیان کردیے ہیں۔

۱۰۔ انفرادی ذمہ داری

ملت ابراہیمی کا ایک اہم عنصر یہ عقیدہ ہے کہ ہر شخص اپنے کاموں کا آپ ذمہ دار ہے۔ جو جیسا کرے گا اسے اسی کے مطابق بدلہ ملے گا۔ اگر اس کے کام اچھے ہوں گے تو وہ اجر کا مستحق ہوگا لیکن اگر بدعملی کا مرتکب ہوا ہوگا تو اسے اس کے مطابق سزا ملے گی۔ نہ کوئی شخص پیدائشی گناہ گار ہے اور نہ کوئی دوسرے کے گناہوں کو بخشوا سکتا ہے۔ قرآن نے صحف ابراہیم کی جن تعلیمات کا حوالہ دیا ہے ان میں سب سے پہلے اسی عقیدہ کو بیان کیا گیا ہے:

اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِيْ صُحُفِ مُوْسٰى وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰٓى ۔ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۙ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۙ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ۙ ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ۙ (النجم: ۳۶-۴۱)

کیا اسے ان باتوں کی کوئی خبر نہیں پہنچی جو موسیٰ کے صحیفوں اور اس ابراہیم کے صحیفوں میں بیان ہوئی ہیں جس نے وفا کا حق ادا کردیا؟ یہ کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور یہ کہ انسان کے لیے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کی اس نے سعی کی ہے اور یہ کہ اس کی سعی عنقریب دیکھی جائے گی پھر اس کی پوری جزا اسے دی جائے گی۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۙ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ..... اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۙ صُحُفِ

فلاح پاگیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی اور اپنے رب کا نام یاد کیا پھر نماز پڑھی ..... یہی بات پہلے آئے ہوئے صحیفوں میں

اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ۝ (الاعلیٰ: ۱۴-۱۹) بھی کہی گئی تھی۔ ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں

خلاصۂ بحث

پیش نظر مقالہ میں ملت ابراہیمی کے صرف چند اہم اور بنیادی عناصر بیان کیے گئے ہیں۔ ورنہ قرآن وحدیث، کتب تاریخ وسیر اور کتب مقدسہ کی روشنی میں کچھ مزید عناصر تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ اس مقالہ میں صرف انھیں عناصر کا تذکرہ کیا گیا ہے جنھیں اہل کتاب نے ترک کر دیا ہے۔ باوجود یہ کہ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ابراہیم کے طریقے کے پیرو ہیں اور ابراہیم کا مذہب، ملت اور شریعت ٹھیک وہی تھی جس پر وہ عمل پیرا ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے ان تمام بنیادی عناصر سے اپنا رشتہ توڑ لیا ہے جو حضرت ابراہیم کی ملت کے ترکیبی عناصر کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس کے برخلاف اسلام ان عناصر کو ٹھیک ٹھیک وہی حیثیت دیتا ہے جو انھیں ملتِ ابراہیمی میں حاصل تھی[۵۵] اس حیثیت سے اسلام بعینہٖ انھیں ارکان وعناصر پر مشتمل ہے جو ملتِ ابراہیمی میں پائے جاتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ وہ ملتِ ابراہیمی کی تجدید کریں اور اہل کتاب کو (جنھوں نے اسے ترک کر کے خواہشات نفس کی پیروی شروع کر دی تھی) ملت ابراہیمی کی اتباع کی دعوت دیں۔ چنانچہ قرآن نے اہل کتاب (جو تحریف شدہ یہودیت اور نصرانیت کو ہدایت کا ضامن قرار دیتے تھے) کی تردید کرتے ہوئے ملت ابراہیمی کی اتباع کو موجب ہدایت قرار دیا اور انھیں اس کی اتباع کی دعوت دی:

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (البقرہ - ۱۳۵)	یہودی کہتے ہیں: یہودی ہو تو راہ راست پاؤ گے عیسائی کہتے ہیں: عیسائی ہو تو ہدایت ملے گی۔ ان سے کہو نہیں بلکہ سب کو چھوڑ کر ملت ابراہیمی کی پیروی کرو اور ابراہیم مشرکوں میں سے نہ تھا۔

تعلیقات وحواشی

۵۵ لسان العرب۔ ابن منظور دار صادر بیروت ۱۹۵۶ء ۱۱/۶۳۱

۲؎ تفسیر طبری جزء ۲۳/ صفحہ ۸ المطبعۃ الکبری مصر ۱۳۲۹ھ
۳؎ ترمذی، کتاب الفرائض باب ماجاء فی ابطال المیراث بین المسلم والکافر
۴؎ ایضاً ۵؎ صحیح بخاری کتاب الجنائز باب ماجاء فی قاتل النفس
۶؎ ترمذی کتاب القدر باب ماجاء کل مولود یولد علی الفطرۃ
۷؎ ترمذی، کتاب الایمان باب افتراق ہذہ الامۃ، یہ روایت ابوداؤد، دارمی اور مسند احمد میں بھی مروی ہے۔
ترمذی نے کہا ہے: ھذا حدیث حسن غریب ۔ ۸؎ ترمذی، ایضاً۔
۹؎ المفردات فی غریب القرآن ۔ راغب اصفہانی دار المعرفۃ بیروت ص۴۷۱
۱۰؎ لغات القرآن جلد پنجم ۔ مولانا سید عبدالدائم جلالی ۔ ندوۃ المصنفین دہلی طبع اول ۱۹۶۱ء ص۴۳۹-۴۴۰
۱۱؎ المفردات ص۴۷۱ ۱۲؎ صحیح بخاری کتاب التفسیر سورۂ قصص باب قولہ انک لاتھدی من احببت اور کتاب الجنائز باب اذا قال المشرک عند الموت لا الٰہ الا اللہ ۔ یہ روایت صحیح مسلم، سنن نسائی اور مسند احمد میں بھی مذکور ہے ۔ ۱۳؎ لغات القرآن پنجم ص۴۴
۱۴؎ المفردات ص۴۷۲ ۱۵؎ لسان العرب ۱۱/ ۶۳۱
۱۶؎ مثلاً حضرت ابن عمرؓ سے مروی ایک حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اذا دخل المیت القبر قال بسم اللہ وباللہ وعلی ملۃ رسول اللہ (جب میت کو قبر میں داخل کیا جائے تو کہے اللہ کے نام سے اور رسول اللہ کی ملت پر) ترمذی کتاب الجنائز باب ماجاء مایقول اذا دخل المیت قبرہ۔
۱۷؎ حضرت ابراہیم کی طرف منسوب بعض کتابیں آج بھی ملتی ہیں مگر ان کی صحت کا کوئی اعتبار نہیں ہے مثلاً ایم آر جیمس نے ۱۸۹۲ء میں کیمرج سے The Book of ABRAHAM نامی ایک کتاب یونانی زبان سے ترجمہ کرکے شائع کی ۔ یورپی زبانوں میں اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں (تفسیر ماجدی) اسی طرح لندن میں ایک مسیحی ادارے نے ۱۹۲۷ء میں The Testament of ABRAHAM کے نام سے ایک کتاب انگریزی زبان میں شائع کی جس کا ترجمہ جی ایچ باکس نے یونانی زبان سے کیا تھا۔ غالباً اصل کتاب عبرانی زبان میں تھی جس کا پہلی صدی عیسوی میں یونانی زبان میں ترجمہ ہوا تھا (تفسیر عبداللہ یوسف علی)
۱۸؎ خود توریت وانجیل میں یرمیاہ نبی حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ کی زبانی یہود کی تحریفات اور دروغ گوئیوں کی جا بجا شہادتیں ملتی ہیں ۔ اس موضوع پر سب سے مستند کتاب مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی اظہار الحق (دو جلدوں میں) ہے جس میں انھوں نے کتاب مقدس کی سیکڑوں تحریفات بیان کرتے ہوئے خود عیسائی علماء کی شہادتیں پیش کی ہیں۔ موجودہ دور میں شیخ احمد دیدات نے اس موضوع پر قابلِ قدر کام

انجام دیا ہے اور اس پر ان کی کئی تصانیف ہیں۔

۱۹؎ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں عراق، شام اور مصر میں بت پرستی کے رواج کی تفصیلات جاننے کے لیے درج ذیل کتابوں کا مطالعہ مفید ہوگا۔ تاریخ ملل قدیمہ۔ سینوبس فرانسیسی اردو ترجمہ سید محمود اعظم فہمی مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ ۱۹۲۱ء/ ۱۳۳۹ھ۔ الدیانات القدیمہ، محمد ابو زہرہ۔ دار الفکر العربی مصر، خطط الشام۔ محمد کرد علی۔ دار العلم للملایین بیروت ۱۳۸۹ھ/۱۹۶۹ء الحضارۃ المصریہ۔ گوستاف لوبون عربی ترجمہ۔ م صادق رستم۔ المطبعۃ العصریہ مصر۔ ارض القرآن سید سلیمان ندویؒ دار المصنفین اعظم گڑھ ۱۹۵۵ء۔

۲۰؎ کتاب یشوع باب ۲

۲۱؎ انجیل برناباس اردو ترجمہ آسی ضیائی مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی فصل ۲۶ صـ۵۴

۲۲؎ انجیل برناباس فصل ۷۹ صـ۱۲۱

۲۳؎ مثلاً دیکھئے الانعام۔ ۷۳ ومابعد، الانبیاء۔ ۵۱ ومابعد، العنکبوت ۱۶۔۱۷، الصافات۔ ۸۳ ومابعد الزخرف: ۲۶۔۲۷ وغیرہ۔

۲۴؎ بت شکنی کے اس واقعہ کا تذکرہ انجیل برناباس میں بھی موجود ہے البتہ اس کا بیان بعض چیزوں میں قرآن سے کچھ مختلف ہے۔ تقابلی مطالعہ کے لیے دیکھئے انجیل برناباس فصل ۲۸ صـ۵۷-۵۸

۲۵؎ تفسیر ابن کثیر ۲۱/۶ ۲۶؎ ایضاً ۴۰۲/۲

۲۷؎ کتاب پیدائش باب ۱۵ ۶ ۲۸؎ عبرانیوں کے نام پولس رسول کا خط باب ۱۱ ۸ — ۱۹

۲۹؎ کتاب پیدائش باب ۱۲ ۱۔۴ ۳۰؎ انجیل برناباس فصل ۴۵ صـ۸۲-۸۳

۳۱؎ کتاب پیدائش باب ۱۲ ۱۰-۱۲ ۳۲؎ ایضاً باب ۱۲ ۱۶ — ۱۸

۳۳؎ ایضاً باب ۱۷ ۱-۲ ۳۴؎ ایضاً باب ۱۸ ۱۷-۱۹ ۳۵؎ کتاب نحمیاہ باب ۹ ۵-۸

۳۶؎ تفسیر ابن کثیر ۲۴۴/۴

۳۷؎ التکمیل فی اصول التاویل۔ مولانا فراہیؒ دائرہ حمیدیہ ۱۳۸۸ھ صـ۵۹ نیز ششماہی مجلہ علوم القرآن جولائی تا دسمبر ۸۸ء میں راقم کا مقالہ "لفظ امت کی تحقیق" صـ۳۶-۳۸

۳۸؎ کتاب پیدائش باب ۱۷ ۱۵- ۱۷ ۳۹؎ ایضاً باب ۱۷ ۱ — ۲

۴۰؎ ایضاً ۲۱ ۲۳، حضرت ابراہیم کے دعا کرنے کا تذکرہ اور کئی مقامات پر ہے مثلاً دیکھئے کتاب پیدائش باب ۱۲ ۱۷، باب ۱۳ ۸، باب ۱۳ ۳-۴ ۴۱؎ کتاب پیدائش باب ۱۳ ۶-۷

۴۲؎ ایضاً باب ۱۳ ۸ ۴۳؎ ایضاً باب ۱۳ ۳-۴ ۴۴؎ ایضاً باب ۱۳ ۱۸

۴۵؎ ایضاً باب ۲۲ ۱- ۱۹

۴۶ پیدائش باب ۴ میں ہے کہ "اور ہابل بھی اپنے بھیڑ بکریوں کے کچھ پہلوٹھے بچوں کا اور کچھ ان کی چربی کا ہدیہ لایا اور خداوند نے ہابل کو اور اس کے ہدیہ کو منظور کیا" ۴۷ کتاب پیدائش باب ۹ - ۱۱

۴۸ ایضاً باب ۱۴ ۴۹ ایضاً باب ۲۳ - ۲۷ ۵۰ ایضاً باب ۲۱ ۴

۵۱ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء باب واتخذ اللہ ابراہیم خلیلا

۵۲ فتح الباری شرح صحیح البخاری - ابن حجر جلد ۶ ص ۲۴۵ باب واتخذ اللہ ابراہیم خلیلا

۵۳ کتاب پیدائش باب ۱۸ - ۳ - ۸ ۵۴ سورۂ الذاریات - ۲۴ کے علاوہ یہ واقعہ الحجر - ۵۱ وما بعد اور ہود - ۹۶ وما بعد میں بھی بیان ہوا ہے۔ ۵۵ یہود نے ملت ابراہیمی کے کن کن عناصر کو ترک کر دیا ہے، عیسائیت میں اس کے برخلاف کون سے گمراہ کن نظریات وضع کر دیے گئے ہیں اور اسلام میں ملت ابراہیمی کے ان عناصر کو کیا اہمیت دی گئی ہے۔ یہ ایک تفصیل طلب موضوع ہے جس پر انشاء اللہ آئندہ دوسرے مقالے میں بحث کی جائے گی اور خود توریت، انجیل اور قرآن کی روشنی میں اس کا جائزہ لیا جائے گا۔

اعلان ملکیت سہ ماہی تحقیقات اسلامی - فارم ۴ رول ۹

۱۔ مقام اشاعت: پان والی کوٹھی - دودھ پور، علی گڑھ یوپی

۲۔ نوعیت اشاعت: سہ ماہی

۳۔ پرنٹر پبلشر: سید جلال الدین عمری

۴۔ قومیت: ہندوستانی

پتہ: پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ - یوپی

۵۔ ایڈیٹر: سید جلال الدین عمری

پتہ: پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ، یوپی

۶۔ ملکیت: ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی

پان والی کوٹھی، دودھ پور - علی گڑھ، یوپی

بنیادی ارکان کے اسمائے گرامی

(۱) مولانا محمد فاروق خاں (صدر) ۳۵۳، بازار چتلی قبر، دہلی ۶

(۲) جناب افضل حسین (رکن) "

(۳) جناب سید یوسف (رکن) "

(۴) جناب امین الحسن رضوی (رکن) ہمدرد نگر - نئی دہلی۔

(۵) ڈاکٹر محمد رفعت - شعبۂ فزکس - جامعہ ملیہ - نئی دہلی۔

(۶) مولانا کوثر یزدانی ۱۳۵۴ - بازار چتلی قبر - دہلی۔

(۷) ٹی - کے عبداللہ صاحب الاتھن کنڈی ہاؤس، ملیری کاوی کٹ

(۸) ڈاکٹر حمید اللہ - شعبہ انگریزی - مسلم یونیورسٹی - علی گڑھ

(۹) ڈاکٹر احمد سجاد - بریا تو ہاؤسنگ سوسائٹی کالونی طارق منزل پٹنہ

(۱۰) مولانا سید حامد علی - میران پور کٹرہ - شاہجہاں پور - یوپی

(۱۱) سید جلال الدین عمری (سکریٹری)

پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ۔

مندرجہ معلومات میرے علم ویقین کی حد تک بالکل درست ہیں۔

پبلشر: سید جلال الدین عمری

حضراتِ صوفیہ اور علمِ حدیث

ڈاکٹر غلام قادر لون

اہلِ تصوف ہمیشہ دعویٰ کرتے رہے ہیں کہ ان کا طریقِ کار قرآن وسنت سے ماخوذ ہے۔ چنانچہ ابوسلیمان دارانی (م ۲۱۵ھ) کا قول ہے "میرے دل میں جب بھی صوفیہ کے نکات میں سے کوئی نکتہ گزرتا ہے تو میں اس وقت تک اسے قبول نہیں کرتا جب تک کہ دو عادل گواہ یعنی قرآن وسنت اس کی تائید نہ کریں[1]" ابوالحسین نوری (م ۲۹۵ھ) کہتے ہیں "جو شخص اس حالت کا مدعی ہو جو اسے دائرۂ شریعت سے خارج کرتی ہے اس کے پاس نہ جاؤ[2]" سہل بن عبداللہ تستری (م ۲۷۳ھ) کے مطابق "ہر وجد جس کی شہادت قرآن وسنت سے نہ ملے باطل ہے[3]" بایزید بسطامی (م ۲۶۱ھ) کا ارشاد ہے کہ اگر تم کسی ایسے آدمی

---

[1] ابوالقاسم قشیری: الرسالۃ القشیریہ، المطبعۃ العامرۃ العثمانیہ مصر، ۱۳۰۴ھ ص ۲۵۔ ابونصر سراج طوسی: اللمع، تحقیق وتقدیم عبدالحلیم محمود۔ طہٰ عبدالباقی سرور، دارالکتب الحدیثہ مطبعۃ السعادۃ قاہرہ مصر، ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۰ء ص ۱۴۶۔ ابوالفرج عبدالرحمٰن ابن جوزی: تلبیس ابلیس، دارالطباعۃ المنیریہ القاہرہ ۱۳۶۹ھ/۱۹۵۰ء ص ۱۶۸ مولانا جامی نے نفحات الانس میں اس قول کو بایں الفاظ نقل کیا ہے "ربما ینکت الحقیقۃ فی قلبی اربعین یومًا فلا آذن لہا ان تدخل فی قلبی الا بشاہدین من الکتب والسنۃ (اکثر چالیس دن تک میرے دل میں حقیقت کا نزول ہوتا رہتا ہے مگر جب تک دو عادل گواہ یعنی قرآن وسنت تصدیق نہیں کرتے میں اسے اپنے دل میں جگہ نہیں دیتا۔ دیکھئے نفحات الانس بذیل "ابوسلیمان دارانی"

[2] الرسالۃ القشیریہ ص ۱۹، تلبیس ابلیس ص ۱۶۸۔ ابن قیم: مدارج السالکین، مطبعۃ المنار مصر ۲: ۲۵۷

[3] اللمع ص ۱۰۴، شہاب الدین سہروردی، عوارف المعارف علی ہامش احیاء، مصر ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۹ء ۱: ۳۱۷۔ ابن تیمیہ: مجموع فتاویٰ، مطابع ریاض، الطبعۃ الاولیٰ ۱۳۸۱ھ تا ۱۳۸۲ھ ۱۱: ۵۹۵

کو دیکھو جو ہوا میں اڑتا ہے تو بھی اس وقت تک اس سے دھوکہ مت کھانا جب تک یہ نہ دیکھ لو کہ وہ امر و نہی اور حدودِ شرع کا کتنا پابند ہے۔[۱] جنید بغدادی (م ۲۹۷ھ) کہتے ہیں "ہمارے اس علم کی بنیاد قرآن و سنت ہے جو قرآن کی تلاوت نہ کرے اور حدیث نہ لکھے اس معاملے میں اس کی پیروی نہیں کی جائے گی۔"[۲] ابوالحسن حواری کا قول ہے "دائرۂ سنت نبوی سے باہر ہر عمل باطل ہے۔"[۳] مندرجہ بالا اقوال کا صوفیہ کی طرف انتساب اس لیے بھی صحیح لگتا ہے کہ محدثین اور مورخین کے علاوہ تصوف کے ناقدین نے بھی انھیں اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے مثلاً ابن جوزی (م ۵۹۷ھ) نے اپنی مشہور کتاب تلبیسِ ابلیس میں ان اقوال کو بیان کیا ہے اور اس سے متقدمین صوفیہ کی پابندیٔ شریعت کا نتیجہ اخذ کیا ہے۔[۴] ابن تیمیہ (م ۷۲۸ھ)[۵] اور ابن قیم (م ۷۵۱ھ)[۶] نے بھی ان اقوال کو اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے۔

ان اقوال سے بظاہر ایسا لگتا ہے کہ صوفیہ قرآن و حدیث کی روشنی ہی میں راہِ سلوک پر گامزن ہونا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ سالک علم سے پوری طرح بہرہ ور ہو۔ مگر زحمت اس وقت پیش آتی ہے جب تصوف کی کتابوں میں ہمیں بکثرت ایسے اقوال ملتے ہیں جو اپنے اندر علم بیزاری اور معارف دشمنی کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔ اس طرح صوفیہ کے وہ تمام اقوال حقیقت سے خالی نظر آتے ہیں جن میں انھوں نے قرآن و سنت کی پابندی کا بار بار دعویٰ کیا ہے۔ ایک صوفی سے جب پوچھا گیا "کیا تم محدث عبدالرزاق سے حدیث سننے کے لیے سفر نہیں کروگے تو انھوں نے جواب دیا جو خدا سے (براہِ راست) سنتا ہے وہ عبدالرزاق سے سماعت کیا کرے؟"[۷] ابوحفص نیشاپوری (م ۲۶۴ھ) کا کہنا ہے "جب سے میں نے خدا

---

[۱] ابن خلکان: وفیات الاعیان، دار صادر بیروت ۱۳۹۸ھ/۱۹۷۸ء ۲: ۵۲۱۔ حافظ ذہبی: میزان الاعتدال، بیروت، الطبعۃ الاولیٰ ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۳ء ۲: ۳۴۶۔ تلبیس ابلیس ص ۱۶۸۔ الرسالۃ القشیریہ ص ۱۸

[۲] الرسالۃ القشیریہ ص ۲۲۔ مجموع فتاویٰ ۱۱: ۵۹۵؛ تلبیس ابلیس ص ۱۶۸

[۳] الرسالۃ القشیریہ ص ۲۱۔ مجموع فتاویٰ ۱۱۔ ۵۹۵ [۴] تلبیس ابلیس ص ۱۶۸ و ۳۲۴

[۵] مجموع فتاویٰ ۱۱: ۵۹۵ [۶] مدارج السالکین ۲: ۲۵۷

[۷] عبدالعظیم عبدالسلام شرف الدین: ابن قیم الجوزیہ، مصر، الطبعۃ الثانیہ ۱۳۸۷ھ/۱۹۶۷ء ص ۴۳۶

کو پہچانا اس وقت سے میرے دل میں حق کا گزر ہوا نہ باطل کا"[۱] حارث محاسبی (م ۲۴۳ھ) کہتے ہیں "علم خوف پیدا کرتا ہے، زہد آرام پہنچاتا ہے اور معرفت انابت پیدا کرتی ہے"[۲] جنید بغدادی (م ۲۹۷ھ) کہتے ہیں "جب تم فقیر سے ملو تو نرمی کے ساتھ اس سے ملو، علم کے ساتھ نہ ملو کیوں کہ نرمی اسے مانوس بناتی ہے اور علم اس کے اندر وحشت پیدا کرتا ہے"[۳] بشر حافی (م ۲۲۶ھ) کے بقول روایت حدیث میں استعمال ہونے والا لفظ "حدثنا" دنیا کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے[۴]۔ ابوبکر وراق (م ۔۔۔) سے جب پوچھا گیا کہ آپ نے کتابت حدیث کیوں ترک کر دی تو انھوں نے جواب دیا کہ مجھے ارادت نے اس سے باز رکھا[۵]۔ جعفر خلدی (م ۳۴۸ھ) کا بیان ہے کہ میں عباس نامی ایک محدث کے پاس گیا اور اس سے حدیث لکھی جب اس کے پاس سے چلا تو ایک صوفی ساتھی سے ملاقات ہوئی اس نے پوچھا تمہارے پاس یہ کیا ہے میں نے اسے یہ اوراق دکھائے تو اس نے یہ کہہ کر ان اوراق کو پھاڑ ڈالا "افسوس تم علم خرقہ کو چھوڑ کر علم ورق کو اختیار کرتے ہو" اس کی بات میرے دل میں بیٹھ گئی اور میں نے عباس کے پاس جانا چھوڑ دیا[۶]۔ حصول علم کو اللہ کے حضور میں بے ادبی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایک مشہور صوفی شیخ ابوبکر الدقی (م ۳۵۹ھ) سے سوال کیا گیا کہ اللہ کے حضور میں فقیروں کی بے ادبی کیا ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا "ان کا حقیقت سے علم کی طرف گرنا"[۷]

صوفیہ علم کو حجاب اکبر تصور کرتے ہیں اور شروع ہی سے "صد کتاب وصد ورق وزنار کن" کے اصول پر عمل پیرا رہے ہیں۔ بشر حافی نے کتابوں میں دس بستے زمین میں دفن کیے[۸]۔ ابوبکر وراق سے ان کے استاد حکیم ترمذی (م ۔۔۔ھ) نے یہ کہا: یہ کتابیں دریائے جیحوں میں پھینک آؤ" ابوبکر وراق نے انھیں گھر میں رکھا اور واپس آکر اطلاع دی کہ کتابیں دریا میں پھینک دی گئی ہیں۔ استاد

---

[۱] الرسالۃ القشیریہ ص ۱۸۴، شیخ علی ہجویری: کشف المحجوب، اسلام آباد ۱۳۹۸ھ / ۱۹۷۸ء ص ۲۴۴

[۲] ابوعبدالرحمن السلمی: طبقات الصوفیہ تحقیق نورالدین سدیبہ، مطابع دارالکتاب العربی بمصر الطبعۃ الاولیٰ ۱۳۷۲ھ / ۱۹۵۲ء ص ۵۸ [۳] الرسالۃ القشیریہ ص ۱۶۳، طبقات الصوفیہ ۱۶۰، اللمع ص ۲۳۳

[۴] امام غزالی: احیاء علوم الدین مصر ۱۳۵۸ھ / ۱۹۳۹ء ۱: ۶۷

[۵] الرسالۃ القشیریہ ص ۱۶۴ [۶] تلبیس ابلیس ص ۳۲۸

[۷] الرسالۃ القشیریہ ص ۱۶۴ [۸] احیاء ۱: ۶۷

نے پوچھا "کتابیں دریا میں پھینکنے کے بعد تم نے کیا دیکھا ابوبکر وراق نے جواب دیا "کچھ نہیں" یہ سن کر استاد نے کہا تم نے کتابیں دریا میں نہیں پھینکیں۔ جاؤ پھینک آؤ۔ ابوبکر وراق نے جاکر کتابیں دریا میں پھینک دیں۔ پانی کے دو حصے ہو گئے اور ایک صندوق نمودار ہوا جس میں کتابیں بند ہو کر پانی میں چلی گئیں۔ حقیقت حال دریافت کرنے کے لیے ابوبکر وراق جب استاد کے پاس آئے تو انھوں نے جواب دیا "میں نے اصول و تحقیق میں کچھ کتابیں لکھی تھیں جو لوگوں کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔ خضر علیہ السلام نے یہ کتابیں مجھ سے طلب کیں۔ اللہ کا حکم ہوا انھیں یہ کتابیں پہنچا دو"۔[۱]

بغداد میں ایسے صوفیہ بھی رہے ہیں جو حدیث لکھ کر اسے دریائے دجلہ میں پھینک آتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم نے اس کا حق ادا کر دیا۔[۲] ابوالحسن حواری نے تیس سال تک حدیث کا علم حاصل کیا آخر میں اپنی کتابیں یہ کہہ کر دریا میں پھینک دیں "اے علم میں تمہاری تحقیر یا بے وقعتی کے پیش نظر ایسا نہیں کر رہا ہوں بلکہ میں نے تجھے اس لیے حاصل کیا تھا تاکہ اللہ تک پہنچنے کے لیے تیری رہنمائی مل جائے۔ پس جب تیرے ذریعہ میں ہدایت پا گیا تو میں تجھ سے بے نیاز ہو گیا۔[۳] ابوسعید ابوالخیر (م ۴۴۰ھ) کہتے تھے "کتابو! تم اچھی رہنما ہو لیکن حصول مقصد کے بعد رہنما فضول ہے۔[۴] ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ اس معاملہ (تصوف) میں پہلا قدم دواتوں کا توڑنا، کتابوں کا پھاڑنا اور علم کا فراموش کرنا ہے۔[۵] شیخ نظام الدین اولیاء (م ۷۲۵ھ) کہتے ہیں کہ جب شیخ ابوسعید ابوالخیر کمال حال کو پہنچ گئے تو انھوں نے اپنی کتابوں کو ایک گوشہ میں رکھ دیا۔ ایک دن ان کا مطالعہ کرنے لگے تو ہاتف غیبی نے آواز دی کہ اے ابوسعید ہمارا عہد نامہ واپس کر دو کیونکہ تم دوسری چیز میں مشغول ہو گئے۔[۶] شیخ نظام الدین اولیاء کے بیان کے مطابق ایک پیر طریقت کے بیٹے نے علم میں کمال حاصل کرنے کے بعد چاہا کہ راہ سلوک پر گامزن ہو جائے۔ چنانچہ وہ اپنے باپ کے پاس آیا اور کہا کہ میں درویشی اختیار

---

[۱] کشف المحجوب ص ۱۲۹-۱۳۰ [۲] تلبیس ابلیس ص ۳۲۵ [۳] تلبیس ابلیس ص ۳۲۵

[۴] R. A. Nicholson, Studies in Islamic Mysticism Delhi 1976 P.P. 21

[۵] Studies in Islamic Mysticism P.P. 21

[۶] امیر حسن علا سنجری۔ فوائد الفواد (تصحیح و تقدمہ محمد لطیف ملک لاہور ۱۳۸۶ھ/۱۹۶۶ء جلد سوم مجلس اول ص ۱۵۷

کرنا چاہتا ہوں۔ باپ نے کہا چلہ کرو۔ جب وہ چلہ کرنے کے بعد باپ کے پاس آیا تو انھوں نے لڑکے سے چند مسائل پوچھے۔ اس نے تمام مسائل کا جواب دیا۔ جواب سن کر باپ نے اس سے کہا کہ تمہیں اس چلہ سے کوئی فائدہ نہیں ہوا جاؤ ایک اور چلہ کرو۔ لڑکا دوسری بار چلہ کر کے جب باپ کے پاس آیا تو انھوں نے چند ایک مسائل ان سے پوچھے۔ لڑکے نے اب کی بار جواب میں جگہ جگہ غلطی کی۔ باپ نے حکم دیا کہ ایک اور بار چلہ کشی کرو جب لڑکا تیسری بار چلہ ختم کر کے باپ کے پاس پہنچا۔ انھوں نے چند مسائل پوچھے مگر لڑکا اس قدر مشغول ہو گیا تھا کہ اس سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔[1] شیخ نظام الدین اولیا، کا یہ بھی کہنا ہے کہ اگر کام ہے تو صرف مشغولی حق ہے باقی سب چیزیں اس دولت کی مانع ہیں۔ اگر میں کبھی ان کتابوں کا جو میں نے پڑھی ہیں مطالعہ کرتا ہوں تو مجھ پر ایک وحشت طاری ہوتی ہے اور میں اپنے دل میں سوچتا ہوں کہ کہاں آ پڑا۔[2]

صوفیہ کی اس علم بیزاری کا نتیجہ یہ ہوا کہ فن حدیث سے انھیں کوئی مناسبت پیدا نہ ہو سکی کیوں کہ یہ وہ فن ہے جس میں سخت محنت، دقتِ نظر، کثیر مطالعہ اور تفتیش رجال کے لیے سخت جانفشانی کی ضرورت ہوتی ہے اور ان کے پاس ان چیزوں کے لیے وقت نہیں تھا۔ غالباً یہ ان کے بس کا کام بھی نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ملفوظات اور کتابوں میں عموماً ایسی احادیث کے حوالے ملتے ہیں جو نہ صرف یہ کہ رسول اللہ کی طرف غلط طور پر منسوب ہیں بلکہ کہیں کہیں تو قرآن مجید اور سنت ثابتہ سے بھی متناقض نظر آتی ہے۔

صوفیہ کی طرف سے سب سے زیادہ بے احتیاطی اسناد کے باب میں برتی گئی۔ اسناد کو فنِ حدیث میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ محمد بن سیرین (م ۱۱۰ھ) کا قول ہے "حدیث دین ہے اس لیے دیکھ لو دین کس سے حاصل کر رہے ہو"[3] اسناد سے بے احتیاطی برتنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ محدثین نے صوفیہ اور زہاد کو روایت حدیث کے سلسلے میں ناقابلِ اعتماد

---

[1] فوائد الفواد جلد دوم، مجلس ۳۱۔ ص ۱۳۶ — ۱۳۷

[2] فوائد الفواد جلد دوم، مجلس اول ص ۱۵۷

[3] امام مسلم، صحیح مسلم، بشرح نووی، دار احیاء التراث العربی، بیروت لبنان ۱۳۹۲ھ / ۱۹۷۲ء ۱: ۸۴، خطیب بغدادی، الکفایہ فی علم الروایہ، حیدرآباد دکن ۱۳۵۷ھ ص ۱۲۱

قرار دیا۔ مشہور محدث یحیٰی ابن سعید (م ۱۹۸ھ) اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں "تم حدیث کے معاملے میں اہل خیر (زہاد) کو سب سے جھوٹا پاؤ گے"[1] امام مسلم (م ۲۶۱ھ) کی رائے ہے کہ ان کی زبانوں سے جھوٹ بلا ارادہ سرزد ہو جاتا ہے[2] حضرت حسن بصریؒ (م ۱۱۰ھ) کو امام ذہبی (م ۷۴۸ھ) نے کثیر التدلیس کہا ہے[3] حضرت علی کے شاگرد کمیل ابن زیاد کو بعض محدثین نے منکر الحدیث بتایا ہے[4] یعنی وہ ثقہ راویوں کے خلاف روایات بیان کرتے ہیں۔ حضرت حسن بصریؒ کے شاگرد فرقد سنجی (م ؟) کے بارے میں محدث ایوب نے صاف صاف کہا کہ فرقد صاحب حدیث نہیں ہے[5] امام بخاری (م ۲۵۶ھ) کے نزدیک ان کی احادیث میں منکر روایات ہیں[6] امام نسائی (م ۳۰۳ھ) کے نزدیک وہ ضعیف ہیں[7] عبدالواحد ابن زید (م ۱۷۷ھ) جو علم باطن کی روایت میں ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں ان کو امام بخاری نے متروک الحدیث کہا ہے[8] امام نسائی بھی ان کے متعلق یہی رائے رکھتے ہیں[9] مشہور زاہد مالک بن دینار (م ۱۳۱ھ) کو محدثین نے حدیث میں معتبر نہیں مانا ہے[10] ایک اور زاہد عباد بن کثیر کے زہد و تقشف کی تعریف میں محدثین رطب اللسان رہے ہیں مگر حدیث کے بارے میں ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان سے حدیث مت لو[11] ذوالنون مصری (م ۲۴۵ھ) پر حدیث وضع کرنے کا اتہام ہے[12] احمد بن عطا کو محدث دارقطنی نے متروک الحدیث قرار دیا ہے[13] یہ لوگوں کو اللہ کی طرف راغب کرنے کے لیے باطل حدیثوں کا سہارا لیتے تھے[14] ابوعلی روزباری (م ۳۲۲ھ)

---

[1] صحیح مسلم ۱: ۹۴ - الکفایہ ص ۱۲۱ تا ۱۲۳ [2] صحیح مسلم ۱: ۹۵

[3] میزان الاعتدال ۱: ۵۲۷ [4] میزان الاعتدال ۳: ۵۱۴ [5] صحیح مسلم ۱: ۱۲۲

[6] امام بخاری: کتاب الضعفاء الصغیر، تحقیق محمود ابراہیم زاید، دارالوعی بحلب، الطبعۃ الاولی ۱۳۹۶ھ ص ۹۴

[7] امام نسائی: کتاب الضعفاء والمتروکین تحقیق محمود ابراہیم زاید، دارالوعی بحلب، الطبعۃ الاولی ۱۳۹۶ھ ص ۸۷

[8] کتاب الضعفاء الصغیر ص ۷۶ [9] کتاب الضعفاء والمتروکین ص ۶۹

[10] میزان الاعتدال ۳: ۴۲۶ [11] صحیح مسلم ۱: ۹۴

[12] کنانی، تنزیہ الشریعۃ المرفوعۃ عن الاخبار الموضوعۃ، بیروت لبنان ۱۹۷۹ء/۱۳۹۹ھ ۱: ۴۳-۴۴

[13] ابن حجر عسقلانی، لسان المیزان، حیدرآباد، الطبعۃ الاولی ۱۳۲۹ھ تا ۱۳۳۱ھ ۱: ۲۲۱

[14] لسان المیزان ۱: ۲۲۱-۲۲۲

کو حدیث میں ناقابل اعتماد قرار دیا گیا ہے خطیب بغدادی (م ۴۶۳ھ) کا کہنا ہے کہ انھوں نے ایسی احادیث بیان کی ہیں جن میں فاش غلطیاں پائی جاتی ہیں[۱] ابراہیم خواص (م ۲۹۱ھ) کے متعلق ابن طاہر کی رائے ہے کہ ان کے پاس موضوع احادیث ہیں حاکم نے انھیں متروک الحدیث بتایا ہے[۲] ابوعبدالرحمٰن السلمی (م ۴۱۲ھ) صوفیہ کے لیے حدیثیں وضع کیا کرتے تھے[۳]

ان صوفیہ کے زہد و تقشف کا اعتراف محدثین کو بھی تھا مگر تنہا زہد و تقشف اعتماد کی سند نہیں بن سکتا تھا۔ ربیعہ بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں ہمارے بھائیوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں جن کی دعاؤں کی برکت کے ہم امیدوار رہتے ہیں لیکن اگر کبھی ہمارے سامنے گواہی دیں تو ہم ان کی گواہی قبول نہیں کریں گے[۴] یحییٰ ابن سعید کہتے ہیں کہ میں نے حدیث میں صالحین کو سب سے سخت فتنہ پایا[۵] انھیں کا قول ہے کہ میں ایک لاکھ دینار کی امانت داری کے لیے جس آدمی کو صحیح سمجھتا ہوں ایک حدیث کے سلسلہ میں اسے امین نہیں مانتا ہوں[۶] امام مالک (م ۱۷۹ھ) کہتے ہیں کہ میں نے مدینہ میں شریف مشائخ سے کوئی حدیث نہیں لی جن کو اگر بیت المال سپرد کیا جاتا تو وہ امین ثابت ہوتے[۷] صالح المری اتنے رقیق القلب تھے کہ ان کی قرأت سن کر کچھ لوگوں کی روح پرواز کر گئی مگر امام بخاری نے انھیں منکر الحدیث کہا[۸] اور امام مسلم نے قابل اعتنا نہ سمجھا[۹]

بعد کے ادوار کے اکابر صوفیہ کو بھی حدیث میں قابل حجت تسلیم نہیں کیا گیا۔ امام غزالی (م ۵۰۵ھ) شیخ عبدالقادر جیلانی (م ۵۶۱ھ) اور محی الدین ابن عربی (م ۶۳۸ھ) کے متعلق صاف صاف کہا گیا ہے کہ ان کا تقویٰ سر آنکھوں پر مگر حدیث میں قابل اعتماد نہیں ہیں بعض ایسے محدثین جو تصوف کے ذوق چشیدہ تھے جیسے محمد بن طاہر مقدسی، وہ بھی اسی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ ان بزرگوں کی کتابوں میں جو احادیث ملتی ہیں ان میں سے بعض پر محدثین نے سخت تنقید

---

[۱] لسان المیزان ۱: ۲۲۱-۲۲۲ [۲] لسان المیزان ۱: ۹۹-۱۰۰

[۳] خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، مطبعۃ السعادۃ بمصر، الطبعۃ الاولیٰ ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۱ء ۲: ۲۴۸، میزان الاعتدال ۳: ۵۲۳ [۴] الکفایہ فی علم الروایہ ص ۱۵۸

[۵] الکفایہ فی علم الروایہ ص ۱۵۸ [۶] الکفایہ فی علم الروایہ ص ۱۵۸

[۷] الکفایہ فی علم الروایہ ص ۱۵۹ [۸] کتاب الضعفاء الصغیر ص ۵۹ [۹] صحیح مسلم ۱: ۱۱۱

کی ہے۔ امام غزالی پر محدثین نے ایک بڑا اعتراض یہ بھی کیا ہے کہ انھوں نے اپنی تصانیف میں موضوع احادیث کو نقل کیا ہے۔ سبکی (م ۷۷۱ھ) نے طبقات الشافعیہ میں امام غزالی کی بے سند احادیث پر ایک مستقل باب باندھا ہے جو ایک سو سے زیادہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس باب میں انھوں نے امام موصوف کی بے سند احادیث نقل کی ہیں[۱]۔ امام غزالی نے اپنی کتاب احیاء العلوم کی بنیاد جن کتابوں پر رکھی ہے ان میں ایک قوت القلوب ہے جو ابو طالب مکی (م ۳۸۶ھ) کی تصنیف ہے۔ ابن جوزی نے اس پر سخت تنقید کی ہے اور ان تمام روایات کو جو مختلف ایام و شہور کی نمازوں کے متعلق اس میں درج ہیں موضوع قرار دیا ہے[۲]۔ ابن تیمیہ نے بھی قوت القلوب کی اس خامی کی طرف اشارہ کیا ہے[۳]۔ ملا علی قاری (م ۱۰۱۴ھ) ایام و شہور کی مختلف نمازوں کے متعلق احادیث کو موضوع بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ قوت القلوب اور احیاء العلوم میں ان احادیث کے ذکر سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے[۴]۔ مولانا عبدالحی لکھنوی (م ۱۳۰۴ھ) نے بھی ایام و شہور کی نمازوں سے متعلق احادیث کو رد کیا ہے اور اس سلسلہ میں قوت القلوب اور احیاء العلوم دونوں کو ناقابل اعتبار ٹھہرایا ہے[۵]۔ ان احادیث کے علاوہ بھی قوت القلوب میں موضوع احادیث ہیں مثلاً تجرد کی فضیلت اور اولاد کی مذمت میں جو حدیثیں ہیں انھیں اسماء الرجال کے علماء نے موضوع قرار دیا ہے[۶]۔ ایام و شہور کی نمازوں کے متعلق جو احادیث شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی کتاب "غنیۃ الطالبین" میں موجود ہیں ان کو بھی محدثین نے نشانۂ تنقید بنایا ہے اور قوت القلوب اور احیاء العلوم کے ساتھ ہی اس کا ذکر کیا ہے[۷]۔ غنیۃ الطالبین میں "تقلیم الأظفار" ناخن کاٹنے سے متعلق جو حدیث ہے ابن قیم نے اسے "بدترین موضوعات میں سے ایک" قرار دیا ہے[۸]۔ ملا علی قاری نے بھی اسے "اقبح الموضوعات"

---

۱ سبکی، طبقات الشافعیۃ الکبریٰ، مصر ۱۳۸۸ھ/۱۹۶۸ء ۶: ۲۸۷ - ۳۸۹ ۲ تلبیس ابلیس ص ۱۶۲

۳ مجموع فتاوی ۱۰: ۵۵۱-۵۵۲، ۱۱: ۵۷۸ - ۵۷۹، ۱۳: ۵۵۲

۴ ملا علی قاری: المصنوع فی معرفۃ الحدیث الموضوع، بیروت، الطبعۃ الثانیہ، ۱۳۹۸ھ/۱۹۷۸ء ص ۲۵۹-۲۶۰

۵ عبدالحی لکھنوی، الآثار المرفوعہ، ادارہ احیاء السنہ گرجاکھ گوجرانوالہ پاکستان ص ۳۷-۹۳

۶ ملا علی قاری، الموضوعات الکبیر، المطبع الرفیع المجتبائی دہلی ۱۳۱۵ھ ص ۱۰۴

۷ الآثار المرفوعہ ۳۷-۹۳، مجموع فتاویٰ ۱۱: ۵۷۹

۸ ابن قیم، المنار المنیف، حلب، الطبعۃ الثانیہ ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء ص ۱۴۰

ہی کہا ہے[۱] عبدالرحمٰن السلمی کی کتابوں کے متعلق ابن جوزی کہتے ہیں کہ اس میں موضوع احادیث ہیں[۲] شاہ عبدالعزیز دہلوی (م ۱۲۳۹ھ) حسن ظن کی بنیاد پر حدیث اخذ کرنے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ عبدالرحمٰن السلمی اور دوسرے صوفیہ جو حدیث کے مذاق آشنا نہ تھے اس علت (حسن ظن کی بنیاد پر حدیث لینا) سے متہم ہیں[۳]

مزید برآں علمائے حدیث کا نشانۂ تنقید وہ محدثین بھی بنے ہیں جنھوں نے تصوف کے زیر اثر احادیث کے نقل کرنے میں صحیح و غلط کی تمیز اٹھا دی تھی۔ مثلاً ابونعیم اصبہانی (م ۴۳۰ھ) کی ضخیم کتاب "حلیۃ اولیاء" جو اس زمانے میں چار چار سو دینار میں بکتی اور خریدی جاتی تھی[۴] کے متعلق محدثین کی رائے ہے کہ اس میں بکثرت موضوع روایات ہیں۔ ابن جوزی نے حلیۃ الاولیاء پر سخت تنقید کی ہے[۵] ابن تیمیہ نے اس کی بعض اسانید کو "تاریک اسناد" کہہ کر رد کیا ہے[۶] تصوف کے حامی محدثین نے بھی حلیۃ الاولیاء کے پایہ استناد کو مشکوک ٹھہرایا ہے۔ مثلاً مولانا عبدالحی لکھنوی نے حلیۃ الاولیاء کی اس روایت کو جس میں حضرت عکاشہ کا رسول اللہ سے قصاص طلب کرنے کا ذکر ہے موضوعات میں شمار کیا ہے[۷] ابدال سے متعلق احادیث کو بھی ضعیف اور موضوع بتایا گیا ہے[۸] شاہ عبدالعزیز دہلوی کے بقول ابونعیم اصبہانی کی تصنیفات کا شمار کتب احادیث کے طبقۂ چہارم میں ہوتا ہے اور طبقہ چہارم میں شامل کتابوں میں درج احادیث کے متعلق شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ بہر حال یہ احادیث قابل اعتماد نہیں ہیں لہٰذا عقیدہ اور عمل کے اثبات کے باب میں ان سے تمسک مناسب نہیں[۹] محمد بن طاہر مقدسی کی کتاب "ضعۃ التصوف" کو بھی محدثین نے موضوع احادیث کے معاملے میں اعتراضات

---

۱ الموضوعات الکبیر ص ۱۱۲ ۲ تبلیس ابلیس ص ۱۶۴

۳ شاہ عبدالعزیز دہلوی، عجالہ نافعہ، مطبع نیر اعظم لاہور ۱۲۸۴ھ ص ۳۲

۴ تبلیس ابلیس ص ۱۶۵ ۵ ابن تیمیہ: قاعدہ جلیلہ فی التوسل والوسیلہ، المکتب الاسلامی بیروت ۱۳۹۰ھ/۱۹۷۰ء ص ۸۹ ایک اور جگہ ابن تیمیہ لکھتے کہ اس قسم کی کتابوں میں بکثرت موضوع احادیث ہیں علماء کا اتفاق ہے کہ شریعت کے معاملہ میں ان پر اعتماد جائز نہیں۔ دیکھئے قاعدہ جلیلہ ص ۸۳

۶ آثار المرفوعہ ص ۳۱-۳۲ ۷ حافظ سخاوی: المقاصد الحسنہ، بیروت لبنان، الطبعۃ الاولیٰ ۱۳۹۹ھ/۱۹۷۹ء ص ۸، المنار المنیف ص ۱۳۶ ۸ عجالہ نافعہ ص ۷-۸

کا ہدف بنایا ہے[۱]۔ تصوف کی بنیادی کتابوں، اللمع[۲]، الرسالۃ القشیریہ[۳]، التعرف لمذہب اہل التصوف[۴] اور عوارف المعارف[۵] میں بکثرت موضوع احادیث و روایات منقول ہیں۔

مگر ان سب میں بدترین حال "بہجۃ الاسرار" کا ہے۔ یہ کتاب شیخ عبدالقادر جیلانی اور دوسرے مشائخ کی تاریخ ہے۔ اس کے مصنف علی بن عبداللہ جہضم التنوطی ہیں جنھیں وضع حدیث کا مرتکب قرار دیا گیا ہے امام ذہبی کہتے ہیں کہ اس نے بہجۃ الاسرار میں مصائب (موضوع اور ناقابل اعتماد روایات) جمع کر دی ہیں[۶]۔ اسی قسم کی تنقید ابوبکر مروزی نے بھی کی ہے[۷]۔ ابن رجب حنبلی شیخ جیلانی کے متعلق جمع کیے ہوئے مواد کو (الطم والرم) طومار سے تعبیر کیا ہے[۸]۔ ابن الوردی کی رائے ہے کہ تہجۃ الاسرار میں نادرست باتیں ہیں اور شیخ عبدالقادر کی شان میں ایسی مبالغہ آرائی ہے جو صرف ربوبیت کے شایانِ شان ہے[۹]۔ عبدالرحمٰن واسطی نے بھی مصنفِ کتاب بہجۃ الاسرار کو "کذاب متہم" کیا ہے۔ واسطی کا خیال ہے کہ اس کتاب سے خود عبدالقادر جیلانی کی شخصیت کے خدوخال انجانے لگتے ہیں[۱۰]۔ مستشرقین نے بھی اپنی تحریروں میں شیخ جیلانی کے متعلق مواد

---

[۱] تلبیس ابلیس ص۱۶۵، مجموع فتاوی ۱۱ : ۵۷۸

[۲] مثلاً نمونہ کے لیے دیکھئے لی مع اللہ وقت ..... الخ اور ما وسعنی ارضی ولا سمائی ..... الخ موضوع ہیں جو اللمع ص۱۶۱ پر درج ہیں۔ المصنوع فی معرفۃ الحدیث الموضوع ص۱۵۱ اور ص۱۶۲ پر ان دونوں حدیثوں کا موضوع ہونا بیان کیا گیا ہے۔

[۳] الرسالۃ القشیریہ ص۱۲۴ اور ص۱۲۷ (القوا بفراسۃ المومن ..... الخ جو موضوع حدیث ہے) نیز تنقید کے لیے دیکھئے مجموع فتاوی ۱۰ : ۶۷۸ وما بعد اور ۱۱ : ۵۷۷ - ۵۸۰

[۴] نمونہ کے لیے دیکھئے باب ۳۱ میں علم باطن والی روایت جو موضوع ہے۔ ملاحظہ ہو المصنوع فی معرفۃ الحدیث الموضوع ص۱۲۴، الموضوعات الکبیر ص۴۸-۴۹، تنزیہ الشریعۃ ۱ : ۲۸۰

[۵] دیکھئے عوارف المعارف باب ۲ میں صوف کے متعلق احادیث۔ باب ۱۳ میں حدیث رجعنا من الجہاد الاصغر الی الجہاد الاکبر اور باب ۲۶ میں اربعین کے متعلق احادیث جو علمائے فن کے نزدیک موضوع ہیں۔ ملاحظہ ہو تلبیس ابلیس ص۱۹۲ الموضوعات الکبیر ص۴۰ اور مجموع فتاوی ۱۱ : ۱۹۷ - ۱۹۸۔

[۶] لسان المیزان ۴ : ۲۳۸، الآثار المرفوعہ ص۵۲ [۷] ایضاً [۸] الآثار المرفوعہ ص۵۶

[۹] ابن رجب حنبلی، طبقات الحنابلہ؛ بیروت ۱۳۷۲ھ / ۱۹۵۲ء ۳ : ۲۹۳

[۱۰] J.S. Trimingham, The Sufi orders in Islam, London 1973 PP. 41 (Notes)

کے بارے میں بے اطمینانی کا اظہار کیا ہے۔ دائرہ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگار U. BRAUNE لکھتے ہیں:

"شیخ عبدالقادر جیلانی پر القطنوفی کی کتاب 'بہجۃ الاسرار' جسے دوسرے مصنفوں نے اپنا ماخذ بنایا ہے ان کی وفات کے سو سال بعد لکھی گئی۔ اس کا بیان (جسے الذہبی ناقابل اعتماد قرار دے کر رد کر چکا ہے) انھیں افضل واعظم ولی ظاہر کرتا ہے۔ اس کتاب میں جناب شیخ کو ولی کامل کے اس تصور کے مطابق جو خود ان کے ذہن میں تھا پیش نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ اس کتاب کا پیش کردہ بزرگ ایسا نہیں ہے جو کائناتی تسلیم و رضا کی علامت کا کام دے سکے اور اس جہاں اور اگلے جہاں کو ترک کر دینے اور دونوں جہانوں میں اللہ کی تقدیر کو قبول کرنے میں اس کے نمونے کی پیروی کی جا سکے۔"[1]

ٹرمنگہام (Trimingham) لکھتے ہیں۔

"۵۲۱ھ/۱۱۲۷ء میں جب ان کی عمر پچاس سال سے تجاوز کر چکی تھی وہ ایک ہر دل عزیز واعظ کی حیثیت سے بغداد میں نمایاں ہوئے۔ اس وقت سے ایک حنبلی واعظ نہ کہ ایک صوفی کی حیثیت سے ان کی شہرت میں اضافہ ہوتا رہا۔ وہ صوفی کا نہیں بلکہ عالم کا لباس زیب تن کرتے تھے۔"[2]

امام ذہبی نے تصوف کی چند کتابوں کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے۔

"حافظ سعید بن عمر بروعی کہتے ہیں کہ میں ابوزرعہ (م ۲۶۴ھ) کے پاس تھا۔ ایک سائل نے ان سے حارث محاسبی اور ان کی کتابوں کے متعلق پوچھا انھوں نے جواب میں کہا "ان کتابوں سے بچو یہ بدعتیں اور خرافات ہیں۔ تمہیں چاہیے کہ اثر کو لازم پکڑو۔ اس میں تم وہ چیز پاؤ گے جو تمہیں بے نیاز کر دے گی ان سے کہا گیا کہ ان کتابوں کے اندر نصیحتیں ہیں انھوں نے جواب دیا "جس کے لیے کتاب اللہ میں کوئی نصیحت نہ ہو اس کے لیے

---

[1] اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پاکستان بذیل عبدالقادر جیلانی

[2] The Sufi orders in Islam P.P. 40-41

ان کتابوں میں کوئی نصیحت نہیں۔ کیا تمہیں یہ بات پہنچی ہے کہ سفیانؒ (م ۱۶۱ھ) مالک اور اوزاعی (م ۱۵۷ھ) نے خطرات و وساوس میں اس قسم کی کتابیں تصنیف کی ہیں؟ لوگ بدعت کی طرف کتنی تیزی سے لپکتے ہیں! حارث کا انتقال ۲۴۳ھ میں ہوا اور حارث کی مثال کہاں اگر محدث ابوزرعہ نے متاخرین کی تصانیف مثلاً ابوطالب مکی کی قوت القلوب دیکھی ہوتی اور قوت القلوب کی مثال کہاں اگر ابوزرعہ نے ابن جہضم کی بہجۃ الاسرار اور سلمی کی حقائق التفسیر دیکھی ہوتی تو وہ عقل کھو بیٹھتے۔ کیا ہوتا اگر وہ ابوحامد طوسی کی تصنیفات بالخصوص احیاء العلوم دیکھ لیتے جو موضوعات کا پلندہ ہے کیا ہوتا اگر وہ شیخ عبدالقادر جیلانی کی غنیۃ الطالبین اور ابن عربی کی فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ دیکھ لیتے۔ ہاں جب حارث اس زمانے میں قوم کے ترجمان تھے تو ان کے معاصرین میں ایک ہزار ائمہ حدیث تھے جن میں احمد بن حنبل اور اسحاق بن راہویہ جیسے حضرات بھی شامل تھے اور جب ابن الاخمیسی اور ابن شحانہ حدیث کے امام بن گئے تو دوسری طرف فصوص الحکم کے مصنف اور ابن سبعین جیسے حضرات بھی قطب العارفین ہو گئے۔[۱]

فارسی زبان میں تصوف پر لکھی گئی کتابوں مثلاً کشف المحجوب[۲]، فوائد الفواد، سیر الاولیاء اور نفحات الانس میں بہت سی موضوع روایات ہیں[۳]۔ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ (م ۱۰۳۴ھ) حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (م ۱۱۷۶ھ) علوم اسلامیہ کے ماہر ہیں۔ مگر ان حضرات کی بعض کتابوں میں احادیث کے سلسلہ میں وہ احتیاط نظر نہیں آتی جس کے لیے یہ حضرات مشہور ہیں[۴]

---

۱ میزان الاعتدال ۱: ۴۳۰ - ۴۳۱ ۲ کشف المحجوب کو فارسی ادب تصوف میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور یہ کتاب بلاشبہ اس لائق ہے بھی مگر حدیثوں کے معاملہ میں یہ بھی دوسری کتابوں سے مختلف نہیں ہے۔

۳ فوائد الفواد میں بکثرت موضوع احادیث ہیں مثلاً حضرت علی کے قول "الناس نیام اذا ماتوا انتبھوا" کو حدیث کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ دیکھئے فوائد الفواد جلد دوم، مجلس پنجم ص ۷۹، یہی حال سیر الاولیاء اور نفحات الانس کا ہے۔

۴ مثلاً حضرت مجدد الف ثانیؒ کا رسالہ 'مبداء و معاد' حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تصانیف 'انفاس العارفین' اور 'فیوض الحرمین' وغیرہ۔

حدیث کے معاملہ میں بعض صوفیہ کا یہ دعویٰ رہا ہے کہ وہ کشف و الہام کے ذریعہ حدیث کی صحت کا حال معلوم کر لیتے ہیں اور ان کے اس دعویٰ نے ہمیشہ بحث و مباحثہ کی گرم بازاری کو دعوت دی ہے۔ محدثین میں عجلونیؒ (م ۱۱۶۲ھ) نے محی الدین ابن عربیؒ کی رائے نقل کی ہے کہ بہت سی احادیث طریق روایت کے لحاظ سے صحیح ہوتی ہیں مگر جب انھیں مکاشف (خود ابن عربی کی ذات) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا تو معلوم ہوا کہ وہ صحیح نہیں ہیں، پس ان کا موضوع ہونا معلوم ہوا اور ان پر عمل ترک کیا گیا اگرچہ اہل نقل صحت طرق کی بنا پر انھیں قابل عمل سمجھتے ہیں اور بہت سی حدیثیں جو ضعف طرق کی بنا پر متروک العمل ہیں فی الواقع صحیح ہوتی ہیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات (خواب یا کشف میں) کے وقت انھیں پیش کیا گیا تو ان کی صحت ثابت ہوئی[۱] یہی وجہ ہے کہ ابن عربی نے "کنت کنزا مخفیا..... الخ" والی روایت کو نقل کے لحاظ سے غیر ثابت اور کشف کے لحاظ سے صحیح بتایا ہے[۲] اور قلندر کاکوروی نے بھی یحییٰ بن معاذ رازی (م ۲۵۸ھ) کے قول "من عرف نفسہ فقد عرف ربہ" (جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے خدا کو پہچانا) کو کشفاً صحیح حدیث مان کر اس پر "الشرف" نامی رسالہ تحریر کیا ہے۔ بات یہیں آکر ختم نہیں ہوتی۔ بعض نامور محدثین بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی بھی اس الہامی اور کشفی معیار کے قایل نظر آتے ہیں۔ چنانچہ مکاشفات کے ذریعہ انھوں نے چالیس حدیثیں روایت کی ہیں جن میں بیشتر احادیث نہ صرف یہ کہ باتفاق علمائے حدیث موضوع اور من گڑھت ہیں بلکہ چند ایک عقل سلیم سے بھی معارض ہیں[۳] اس لحاظ سے خواب اور کشف نے مسلمانوں کی فکر پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ مثلاً محی الدین ابن عربی نے فصوص الحکم کے بارے میں دعویٰ کیا ہے کہ اس کتاب کا مواد انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں القا کیا ہے[۴]

۱؎ عجلونی، کشف الخفا، دار احیاء التراث العربی، بیروت ۱۳۵۲ھ ۱: ۹؛ ابن عربی، فصوص الحکم دیکھئے فص داؤدیہ قاہرہ ۱۳۶۵ھ/ ۱۹۴۶ء ۲؎ ابن عربی، فتوحات مکیہ، مطبوعہ مصر ۲: ۳۹۹

۳؎ المقاصد الحسنہ ص ۱۹۴، الموضوعات الکبیر ص ۷۶

۴؎ شاہ ولی اللہ دہلوی، الدر الثمین مشمولہ المسلسلات مکتبہ رحیمیہ سہارنپور۔ یوپی ۱۳۸۵ھ/ ۱۹۶۵ء

۵؎ دیکھئے فصوص الحکم کا مقدمہ

علامہ ابن تیمیہ نے قرآن اور حدیث سے اس خیال کی تردید کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جو شخص اس کا قایل ہے کہ عوام میں کسی شخص کی رسول کے ساتھ وہی حیثیت ہو سکتی ہے جو حضرات خضر کی حضرت موسیٰ کے لیے تھی وہ کافر ہے اللہ کا ارشاد ہے۔

وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبی اذا تمنی القی الشیطان فی امنیته فینسخ الله ما یلقی الشیطان ثم یحکم الله ایاته و الله علیم حکیم	اے نبی! تم سے پہلے ہم نے نہ کوئی رسول ایسا بھیجا ہے۔ نہ نبی (جس کے ساتھ یہ معاملہ پیش نہ آیا ہو کہ) جب اس نے تمنا کی، شیطان اس کی تمنا میں خلل انداز ہو گیا۔ اس طرح جو کچھ بھی شیطان خلل اندازیاں کرتا ہے، اللہ ان کو مٹا دیتا ہے اور اپنی آیات کو پختہ کر دیتا ہے۔ اللہ علیم ہے اور حکیم۔

یہ ضمانت خدا نے صرف رسول اور نبی کو دی ہے کہ وہ شیطان سے محفوظ رہیں کیوں کہ انھیں اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانا ہوتا ہے اور اس پیغام کو ٹھیک ٹھیک پہنچانے کے لیے یہ ضمانت ضروری تھی رسول اور نبی کے علاوہ کسی اور انسان کے لیے چاہے وہ اولیائے متقین میں سے کیوں نہ ہو یہ ضمانت لازمی نہ تھی۔ اولیائے متقین کے لیے ضروری نہیں کہ ان سے قابل مغفرت گناہوں کا صدور نہ ہو اور نہ ہی کوئی ایسی شرط ہے کہ وہ صغیرہ گناہوں کا بالکل ارتکاب ہی نہیں کر سکتے بلکہ یہ بھی شرط نہیں ہے کہ ان سے کوئی کبیرہ گناہ یا کفر سرزد نہ ہو اگر اس کے بعد وہ توبہ کریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

والذی جاء بالصدق وصدق به اولئك هم المتقون لهم ما یشاءون عند ربهم ذالك جزاء المحسنین لیکفر الله عنهم اسوء الذی عملوا ویجزیهم اجرهم باحسن الذی کانوا یعملون[1]	جو شخص سچائی لے کر آیا اور جنھوں نے اس کا سچ مانا، وہی عذاب سے بچنے والے ہیں۔ انھیں اپنے رب کے یہاں وہ سب کچھ ملے گا جس کی وہ خواہش کریں گے۔ یہ ہے نیکی کرنے والوں کی جزا۔ تاکہ جو بدترین اعمال انھوں نے کیے تھے انھیں اللہ ان کے حساب سے ساقط کر دے اور جو بہترین عمل وہ کرتے رہے ان کے لحاظ سے ان کو اجر عطا فرمائے۔

---

[1] مجموع فتاویٰ ۱۱: ۶۶-۶۷

علامہ ابن تیمیہ کا دوسرا استدلال یہ ہے کہ حضرت عمر کے متعلق صحیحین کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم سے پہلی امتوں میں محدّث ہوا کرتے تھے میری امت میں اگر محدث ہیں تو عمر ان میں سے ہیں۔ ترمذی کی ایک روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "اگر میں تم میں نبی بنا کر بھیجا نہ گیا ہوتا تو عمر مبعوث ہوتے" ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں "اللہ تعالیٰ نے عمر کی زبان و قلب پر حق کو جاری کیا ہے میرے بعد اگر کوئی پیغمبر ہوتا تو عمر ہوتے۔ حضرت علی کہا کرتے تھے ہم ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ عمر کی زبان پر فرشتہ بولتا ہے۔ ابن عمر کا قول ہے کہ حضرت عمر جب بھی کہتے کہ میری اس میں یہ رائے ہے تو واقعۃً ایسی ہی ہوتی جیسی وہ کہتے تھے، قیس بن طارق کا کہنا تھا ہم ہمیشہ ذکر کرتے تھے کہ عمر کی زبان سے فرشتہ بولا کرتا ہے۔ حضرت عمرؓ کہا کرتے تھے:۔

"صالح لوگوں کے قریب رہو اور ان کی باتیں سنو کیوں کہ ان سے سچی باتوں کا صدور ہوتا ہے"۔[1]

ابن تیمیہ کے بقول یہی وہ امور صادقہ ہیں جن کی خبر اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر کو دی تھی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اولیاء اللہ کو مخاطبات و مشاہدات کا حصول ہوتا ہے۔ بے شک اس امت میں سب سے افضل ابوبکرؓ ہیں اور ان کے بعد عمر۔ صحیحین کی روایت میں حضرت عمر کو تعین کے ساتھ محدث کہا گیا ہے۔ لہٰذا جو بھی اس امت میں محدث و مخاطب ہوگا حضرت عمر ان سے افضل ہوں گے مگر اس کے باوجود وہ اپنی رائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کرتے تھے۔ ان کی رائے کبھی قرآن سے میل کھاتی تھی جیسا کہ کئی بار ہوا یہ چیز حضرت عمرؓ کے فضائل میں شمار ہوتی ہے اور کبھی ان کی رائے قرآن کے مخالف ہوتی تھی جیسا کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر ہوا۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن شرائط پر مشرکین مکہ سے صلح کی تھی وہ حضرت عمرؓ کو پسند نہ تھیں۔ انھوں نے اپنی اس ناپسندیدگی کا اظہار رسول اللہ کے سامنے کیا بھی۔ ان سے سوالات کئے اس کے بعد حضرت ابوبکر کے پاس آئے اور وہی سوالات کیے جو رسول اللہ سے کیے تھے۔ انھوں نے ان سوالات کا جو جواب دیا وہ وہی تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کو دیا تھا حالانکہ حضرت ابوبکر نے رسول اللہ

---

[1] مجموع فتاوی ۱۱: ۲۰۴ — ۲۰۵

صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب نہیں سنا تھا۔ یہاں پر حضرت ابوبکر کی رائے حضرت عمر کے مقابلہ میں قرآن وسنت کے موافق تھی چنانچہ حضرت عمر نے اپنی رائے سے رجوع کیا[۱]۔ اسی طرح جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال کیا تو حضرت عمر نے پہلے انکار کیا مگر جب حضرت ابوبکر نے کہا کہ ان کا انتقال ہوا ہے تو انھوں نے رجوع کیا۔ منکرین زکوٰۃ سے جنگ کے سلسلہ میں بھی حضرت عمر کی رائے حضرت ابوبکر سے مختلف تھی مگر انھیں اپنی رائے سے رجوع کرنا پڑا کیوں کہ حضرت ابوبکر کی رائے برحق تھی[۲]۔

ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ ان نظائر سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کو حضرت عمرؓ پر تفوق حاصل ہے اور بلاشبہ صدیق محدّث سے بلند مرتبہ رکھتا ہے کیوں کہ صدیق معصوم رسول سے اخذ کرتا ہے اور محدّث اپنے دل سے۔ اس کا دل چونکہ معصوم نہیں ہوتا لہٰذا وہ اس بات کا محتاج ہے کہ اپنے دل کا مواد رسول اللہؐ کے لائے ہوئے پیغام سے ملائے (تاکہ اپنے الہام کی صحت اسے معلوم ہوجائے) اس وجہ سے حضرت عمر فاروق صحابہ سے مشورہ لیتے، مناظرہ کرتے اور بعض امور میں ان کی رائے کی طرف رجوع کرتے۔ دونوں طرف سے قرآن وحدیث سے استدلال کیا جاتا اس دوران وہ کبھی ان سے یہ نہیں کہتے تھے "میں محدّث مُلہَم ہوں تمہیں چاہیے کہ میری بات مانو اور مجھ سے معارضہ نہ کرو"[۳]۔ ابن تیمیہؒ نے اس کے علاوہ اور بھی دلائل دیے ہیں اور متقدمین صوفیہ کے وہ اقوال نقل کیے ہیں جن میں انھوں نے قرآن وسنت کی برتری کا اعتراف کیا ہے۔

علامہ ابن تیمیہؒ کے بعد ان کے شاگرد ابن قیمؒ نے بھی اس ذوقی اور کشفی علم پر بحث کی ہے۔ ان کے بقول جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ اس کے دل میں القا ہونے والے خواطر و ہواجس اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے پیغام سے بے نیاز کردیتے ہیں وہ سب سے بڑا کافر ہے اگر کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ اس کے لیے کبھی یہ خواطر و ہواجس کافی ہیں اور کبھی رسول کا پیغام تو اس کا حال بھی وہی ہے کیوں کہ دل میں القا ہونے والے مواد میں کوئی نصیحت نہیں ہے اور نہ ہی یہ قابل توجہ ہے الا یہ کہ رسولوں کی لائی ہوئی چیز سے

---

[۱] مجموع فتاوی ۱۱: ۲۰۵ - ۲۰۶
[۲] مجموع فتاوی ۱۱: ۲۰۶
[۳] مجموع فتاوی ۱۱: ۲۰۶ - ۲۰۷
[۴] مجموع فتاوی ۱۱: ۲۰۷

معارض نہ ہو بصورت دیگر وہ نفس اور شیطان کی طرف سے القاء ہے[۱]

علامہ ابن قیم نے دو دلیلوں سے استدلال کیا ہے۔

(۱) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے ایک مسئلہ پوچھا گیا۔ انھوں نے اس کا جواب دیا کہ میں اپنی رائے سے اس کا جواب دیتا ہوں اگر یہ صحیح ہے تو اللہ کی طرف سے ہے اور اگر غلط ہے تو میری اور شیطان کی طرف سے ہے اللہ اور اس کا رسول اس سے بری ہے۔ بعض صحابہؓ نے گواہی دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے مسئلے میں یہی فیصلہ سنایا تھا (جو عبداللہ بن مسعود دے چکے تھے) تو اس پر حضرت عبداللہ بن مسعود بے حد مسرور ہوئے۔

(۲) ایک دفعہ حضرت عمر کے منشی نے لکھا "یہ وہ حکم ہے جس کی طرف اللہ نے عمر کی رہنمائی کی" حضرت عمر نے کہا "نہیں، اسے مٹاؤ اور لکھو "یہ عمر کی رائے ہے" اور حضرت عمرؓ نے کہا "اے لوگو میری رائے کو شریعت کا رنگ نہ دو تم نے ابوجندل کے دن مجھے دیکھا اگر رسول اللہؐ کے حکم کو رد کرنا میرے بس میں ہوتا تو میں اسے یقیناً رد کرتا[۲]۔

ذوق اور وجد سے بحث کرتے ہوئے علامہ ابن قیمؒ نے صوفیہ کے "حدثنی قلبی عن ربی" (میرے دل نے میرے رب کی طرف سے یہ بیان کیا ہے) پر تنقید کی ہے ان کا کہنا ہے کہ اگر عبدالرزاق وغیرہ نہ ہوتے اور اخبرنا و حدثنا کے الفاظ نہ ہوتے تو دین دوسرے لوگوں تک نہ پہنچتا۔ جو اخبرنا کے علاوہ کسی اور چیز کا قایل ہے وہ صوفیانہ خیالات، فلسفیانہ قیاس اور نفسانی رائے کا قایل ہے۔ اخبرنا و حدثنا کے بعد صرف متکلمین کے شبہات، منحرفین کی رائیں صوفیوں کے خیالات اور فلسفیوں کی قیاس آرائیاں رہ جاتی ہیں۔ ہر وہ راستہ جس کی دلیل قرآن و سنت سے نہ ملے جہنم اور شیطان رجیم کا راستہ ہے[۳]۔ ابن قیم نے معتدل صوفیہ کے ان اقوال کو بھی نقل کیا ہے جن میں انھوں نے قرآن و سنت ہی کو حجت تسلیم کیا ہے۔

علامہ ابن تیمیہ اور ابن قیم کے علاوہ دوسرے محدثین نے بھی فن حدیث سے صوفیاء کی بے اعتنائی اور بے احتیاطی کا ذکر کیا ہے۔ حافظ سخاوی (م ۹۰۲ھ) کہتے ہیں کہ تمام واضعین حدیث نقصان کا سبب بنے ہیں مگر ان میں سب سے زیادہ مضرت رساں گروہ وہ ثابت ہوا جو صلاح

۱؎ ابن قیم الجوزیہ ص ۴۳۹

۲؎ ابن قیم الجوزیہ ص ۴۳۹-۴۴۰

۳؎ ابن قیم الجوزیہ ص ۴۴۱

وزہد کی طرف منسوب تھا۔[۱] علامہ طاہر پٹنی (م ۹۸۶ھ) بھی اس رائے کے قایل ہیں[۲] چنانچہ اسی بات کو پیش نظر رکھ کر ابن جوزی نے کہا تھا کہ اسناد میں جب کہیں صوفی کا نام آئے تو اس حدیث سے ہاتھ دھولو۔[۳] یہاں یہ بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کا فن تمام علوم اسلامیہ میں مشکل ترین فن ہے اور تقویٰ اور پرہیزگاری کے علاوہ، اس میں محنت اور جانکاہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ صوفیہ اس میں معذور بھی ہیں۔ خدا امام شافعی (م ۲۰۴ھ) پر رحم کرے جنھوں نے صوفیہ کی اس معذوری کی طرف اشارہ کرکے کہا تھا:۔

اسس التصوف علی الکسل — تصوف کی بنیاد کاہلی پر رکھی گئی ہے۔[۴]

حقیقت یہ ہے کہ صوفیا، کو فن حدیث میں استناد کا مقام کبھی حاصل نہیں ہوسکا جہاں تک خواب اور کشف کا تعلق ہے اسے حدیث کی صحت کو جانچنے کا معیار ہرگز نہیں بنایا جاسکتا۔

---

۱ فتح المغیث ص ۱۰۹ ۲ تذکرۃ الموضوعات وقانون الموضوع والضعفاء ص ۶-۷

۳ العلاۃ الناجمہ ص ۷۷ - اذا وقع فی الاسناد صوفی فاغسل یدیک منہ

۴ تلبیس ابلیس ص ۳۲۰

تصنیفی تربیت کیلئے وظائف

ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ کی طرف سے پانچ سو روپے ماہانہ کے دو وظائف دو سال کی مدت کے لیے دیے جائیں گے۔ منتخب ہونے والے افراد کو ادارہ کی طرف سے قیام کی سہولت حاصل رہے گی۔

درخواست دہندہ کا کسی معروف عربی مدرسہ کے درجہ فضیلت یا اس کے مساوی درجہ سے فارغ ہونا ضروری ہے۔ ساتھ ہی ہائی اسکول کے معیار کی انگریزی کی صلاحیت بھی لازمی ہے۔ عربی نہ جاننے کی صورت میں درخواست دہندہ کا ایم اے ہونا ضروری ہے۔ بی اے پاس شدہ افراد بھی درخواست دے سکتے ہیں، بشرطیکہ عربی میں اچھی استعداد رکھتے ہوں۔

تحریک اسلامی سے متعلق یا کسی معروف شخصیت کی تصدیق کے ساتھ حسب ذیل معلومات فراہم کی جائیں۔

(۱) نام (۲) عمر (چوبیس سال سے زیادہ نہ ہو) (۳) پورا پتہ۔ (۴) تعلیمی استعداد (اسناد اور مارکس شیٹ کی نقل کے ساتھ۔ (۵) کورس کے علاوہ مطالعہ کی تفصیل۔ (۶) مطبوعہ یا غیر مطبوعہ مضامین کی نقل، کسی بھی زبان میں۔ (۷) ان موضوعات کی تفصیل جن سے درخواست دہندہ کو خصوصی دلچسپی ہو۔

نوٹ: جو لوگ انگریزی یا ہندی میں لکھنا چاہتے ہوں یا جن کی مادری زبان علاقائی زبان ہو، وہ بھی درخواست دے سکتے ہیں۔ انتخاب انٹرویو کے بعد ہوگا۔ جن لوگوں کو انٹرویو کے لیے بلایا جائے گا انھیں ایک طرف کا کرایہ سکنڈ کلاس مع سلیپر چارجز کے دیا جائے گا۔ جلال الدین عمری۔ سکریٹری ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی۔ پان والی کوٹھی۔ دودھ پور، علی گڑھ

عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں تاریخ نگاری

(تیرھویں صدی عیسوی کے مسلم مورخین کی تالیفات کا تجزیاتی مطالعہ)

پروفیسر اقتدار حسین صدیقی

اسلام کے صدر اوّل ہی میں مسلمانوں میں یہ جذبہ پیدا ہو گیا تھا کہ رسول اللہؐ کی حیات طیبہ سے متعلق سچی اور صحیح روایات کو سپرد قلم کرنا ضروری ہے تاکہ آنے والی نسلیں آپ کی سیرت پاک اور تعلیمات سے بخوبی روشناس ہو سکیں۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے عظیم المرتبت صحابیوں کی سوانح عمریاں مرتب ہونے لگیں۔ چونکہ ان تالیفات کے پیچھے جذبۂ دین کارفرما تھا لہٰذا مولفین نے روایات کی سچائی جاننے کے لیے تحقیق اور تصدیق کے سلسلے میں اہم تنقیدی اصول مرتب کیے، یہ اصول فن اسماء الرجال کے نام سے مشہور ہیں۔ اگرچہ ابتدائی تاریخی لٹریچر زیادہ تر سوانح عمریوں پر مشتمل ہے تاہم یہ لٹریچر دنیا میں سنجیدہ تاریخ نگاری کی تاریخ میں پہلی کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں شروع سے آخر تک تاریخی واقعات درج ہیں اور افسانویت اور غلط روایات کو الگ کیا گیا ہے۔ دوسرے یہ لٹریچر صاحب سوانح کی زندگی کے علاوہ اس کے عہد کے حالات اور معاشرتی نظام کے متعلق بھی ضروری معلومات فراہم کرتا ہے۔

جلد ہی سوانح نگاری کی روایت نے تاریخ نگاری کی روایت کو جنم دیا۔ سوانح نگاروں کی طرح مورخین نے بھی تنقیدی اسالیب کو استعمال کر کے واقعات کی صداقت جاننے کے لیے بڑی احتیاط سے کام لیا۔ عربی زبان میں لکھی ہوئی ان ابتدائی اسلامی تاریخوں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان میں معاشرے کی بڑی حد تک تصویر کشی کی گئی ہے۔ دوسرے ان کا موضوع (Subject matter) اور مواد مذہبی نوعیت کا ہے اور ان میں سیاسی امور کا بیان ضمنی طور پر آتا ہے۔ لہٰذا یہ لٹریچر اسلامی تاریخ کا گراں مایہ حصہ ہے۔ لیکن دسویں صدی عیسوی میں خلافت

بنو عباس کے زوال کے نتیجہ میں جب مسلمانوں کی علاقائی سلطنتیں وجود میں آنے لگیں تو سیاسی تبدیلیوں کے باعث تاریخ نگاری میں بھی تبدیلی رونما ہوئی۔ اس وجہ سے گیارہویں صدی سے مسلم مورخین کی تاریخ سے متعلق نظریات میں جو تبدیلی واقع ہوئی اس کا اثر ان کی تالیفات اور اس کے معیار پر بھی پڑا۔

تاہم یہ بات قابل ذکر ہے کہ گیارہویں صدی عیسوی کے نصف اول میں عالم اسلام میں جو مسلم سلطنتیں وجود میں آئیں اور جن کے فرماں روا امیر یا سلطان کے لقب سے مشہور ہوئے اُن کے سیاسی اور ثقافتی کارناموں سے متعلق علماء اور دانشوروں نے اُن کی سرپرستی سے متاثر ہو کر یا اُن کی سرپرستی حاصل کرنے کی امید میں جو تاریخیں مرتب کیں وہ شروع میں علمی اور ثقافتی روایت کے تحت عربی ہی میں لکھی گئی تھیں اور چونکہ مورخین کی تعلیم و تربیت اسلامی ماحول میں اور اسلامی روایات کے تحت ہوتی تھی اس لیے وہ اپنی تاریخ پر کتابوں کی تکمیل کے سلسلے میں قدیم اسلامی مورخین کا حتی المقدور تتبع کرتے تھے اور ان کے سامنے ماضی کے اسلامی مورخین کے کارنامے ماڈل کا کام دے رہے تھے۔ لہٰذا انھوں نے تمام واقعات کی صداقت جاننے کے سلسلے میں بڑی احتیاط سے کام لیا لیکن چونکہ سیاست اور سیاسی نظام میں عظیم تبدیلی آچکی تھی اور اسلامی سیاسی نظام مسلم یا سلطنت کے سیاسی نظام میں تبدیل ہو چکا تھا۔ لہٰذا یہ تبدیلی مسلم مورخین کی تاریخ نگاری پر بھی اثر انداز ہوئی۔ اب مورخین کی تالیفات کا نفس مضمون زیادہ تر سیاسی ہو گیا۔ مذہب کا ذکر اس وقت ضرورتاً آتا جبکہ کسی سلطان کی خدا ترسی، دینداری اور اُس کے یہاں احترام شریعت جیسی خوبیوں کو بیان کرنا مقصود ہوتا۔ لہٰذا یہ تاریخ نگاری قدیم اسلامی تاریخ نگاری سے مختلف شکل اختیار کر گئی۔ قدیم اسلامی تاریخ میں نفس مضمون بنیادی طور پر مذہبی ہوتا تھا اور اس میں سیاسی امور کا ذکر ضمناً آتا تھا۔ دوسرے گیارہویں صدی عیسوی سے مسلم مورخین کا مقصد زیادہ تر فرماں روائے وقت کی جنگی مہمات، فتوحات، انتظامی اور ثقافتی کارناموں کو بیان کرنا ہوتا تھا اور وہ سلطنت میں واقع ہونے والی اہم تبدیلیوں اور ملکی واقعات کو دربار شاہی سے یا سیاسی مرکز سے متعلق کر کے دیکھتے تھے۔ دار الخلافہ کے باہر صوبائی شہروں اور قصبوں کے حالات کو صرف اس وقت بیان کرتے تھے جبکہ وہاں کوئی غیر معمولی واقعہ یا حادثہ پیش آتا تھا اور جس سے مرکز متاثر ہوتا تھا۔ جیسے بغاوت یا بیرونی حملہ۔ اس کے نتیجہ میں اس عہد کی تاریخ نگاری کا دائرہ بیان (Scope) بہت محدود ہو گیا۔

برخلاف اس کے قدیم اسلامی تاریخ کا Scope بہت وسیع ہے اس میں ہم اس زمانہ کی مکمل تصویر پاتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی واضح کرنا ضروری ہے کہ نئے عہد کی سیاسی اور ثقافتی اہمیت کی تبدیلیاں جن کو یورپ کے مستشرقین نے قدیم ایرانی ثقافت کی نشاۃ ثانیہ سے تعبیر کیا ہے اور مسلم دانشوروں نے اس کو بغیر تنقید اور غور و خوض کے قبول کر لیا ہے قدیم اسلامی تاریخ نگاری کی روایت کو بہت زیادہ متاثر نہ کر سکیں۔ اب بھی مسلم مورخین نے قدیم روایت کے تحت اپنی کتابیں عربی زبان میں لکھیں اس کی وجہ عربی زبان کی علمی اور ثقافتی اہمیت تھی[1]۔ مسلم دانشوروں کے نزدیک بعد میں جب فارسی نثر ترقی یافتہ ہو گئی اور مسلم اشراف میں مطالعہ کے لیے فارسی نثر میں کتابوں کی ضرورت محسوس ہونے لگی تو گردیزی اور بیہقی نے غزنوی سلاطین کے عہد اور اُن کے کارناموں سے متعلق فارسی میں تاریخیں مرتب کیں۔ دونوں کے سامنے العطبی کی کتاب تاریخ الیمنی ماڈل کے طور پر تھی۔ دونوں کے یہاں واقعات تاریخی اہمیت کے درج کیے گئے ہیں۔ برخلاف ان کے قدیم ایرانی تاریخی کتابوں میں قدم قدم پر حقیقت اور افسانویت کی آمیزش ہو جاتی تھی۔ ماقبل اسلام کوئی تاریخ رومانی عنصر سے پاک نہیں تھی۔ غرض یہ کہ مسلم تاریخ نگاروں کو جو چیز ایک امتیازی شان عطا کرتی ہے وہ اُن کا تاریخی شعور تھا وہ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ سلاطین، اکابر یا اصاغر کا ہر فعل تاریخی اہمیت کا حامل نہیں ہوتا۔ اس لیے انھوں نے اپنی تالیفات میں شامل کرنے کے لیے صرف انھیں واقعات اور حقائق کا انتخاب کیا جن کا نظام حکومت اور لوگوں کی زندگی پر اچھا یا بُرا اثر پڑا ہو۔ یہی خصوصیت ہندوستان میں سلطنت کے قیام کے بعد مسلم مورخین کی کتابوں میں نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ اُن میں ہندوستانی ماحول میں جو اہم تبدیلیاں

---

[1] سلطان محمود غزنوی کے دربار سے متعلق العطبی نے اس کے کارناموں پر "تاریخ الیمنی" عربی زبان میں مرتب کی۔ العطبی کی تالیف اور بعد میں قاضی بہاء الدین کی عربی میں سلطان صلاح الدین ایوبی پر تالیف نئی تاریخ نگاری کی بہترین مثالیں کہی جا سکتی ہیں۔ دونوں مولفین نے اپنے ہیرو کے کارنامے بیان کیے ہیں اور ان کی انصاف پسندی اور دوسری اخلاقی خوبیوں کو سراہا ہے۔ اور دونوں میں نفس مضمون سیاسی نوعیت کا ہے۔ مذہب کا ذکر دونوں فرماں رواؤں کی دینداری اور خدا ترسی کو اجاگر کرنے کے سلسلے میں آتا ہے۔

سیاست اور مسلم ثقافت میں پیش آتی رہیں اُن کا ذکر بھی ملتا ہے۔ لیکن یہاں بھی قدیم اسلامی تاریخ نگاری کی روایت کا برابر احترام ہوتا رہا۔ ہندوستانی سلطنت کے نمائندہ تاریخ نگاروں نے واقعات کی چھان بین میں پوری طرح احتیاط برتی ہے۔ نہ تو ساسانی روایت کے مطابق ان کی کتابوں میں سلطان کو انسانی پیکر میں کسی دیوتا یا یزداں کی اولاد میں سے دکھایا گیا ہے اور نہ غیر تاریخی افسانوی قصوں کو زیب داستان کے لیے شامل ہی کیا گیا ہے۔ فارسی کی ان نمائندہ تاریخوں میں خالص تاریخی اہمیت کا مواد شامل کیا گیا ہے۔

اس کی اہمیت کو یہودی اسکالر، برناڈ لوئس نے ان الفاظ میں تسلیم کیا ہے: "تقریباً ہر شاہی خاندان جس نے کسی مسلم ملک پر حکمرانی کی اس سے متعلق متعدد تاریخی کتابیں ہیں۔ بہت سے ممالک میں جہاں بلند پایہ ثقافت تھی وہاں بھی سنجیدہ تاریخ نگاری کی روایت اسلام کے وہاں پہنچنے کے بعد ہی شروع ہوئی۔[1]

دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ فارسی میں لکھنے والے مورخین اپنے معاصر سلاطین کے غیر اسلامی یا جابرانہ کاموں پر تنقید سے گریز کرتے ہیں۔ اس میں یقیناً سلطانِ وقت کا خوف مانع ہوتا تھا لیکن چونکہ مذہبیت اور اخلاقی ذمہ داری کا احساس بھی موجود تھا لہٰذا انھوں نے تنقید کا پوشیدہ طریقہ (esotericism) اختیار کیا۔ اس اسلوبِ بیان کے تحت عبارت کے معنی بظاہر کچھ اور ہوتے ہیں لیکن بغور دیکھنے اور بین السطور کے مطالعہ سے فرمانروائے وقت یا اس کے باپ اور خاندان کی حکمت عملی پر تنقید پنہاں نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی فرمانروا کی بظاہر تعریف ہی میں اس پر تنقید پائی جاتی ہے۔ غرض کہ ان تاریخوں میں مورخ اپنے فرض کی ادائیگی کے لیے اکثر کنایہ اور اشارہ سے کام لیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ نئی فارسی میں تاریخ نگاری کی اہم خصوصیت اس میں چھپے ہوئے تبصرے (Hidden critiques) ہیں۔

ہندوستان میں تاریخ نگاری پر تبصرہ شروع کرنے سے پہلے سلطان اور سلطنت کی سیاسی اور ثقافتی حیثیت کا مختصراً بیان بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان دونوں کے کردار اور عمل سے تاریخ نگاری متاثر ہوئی ہے۔ دورِ حاضر کے مورخین سے عام طور پر یہ غلطی سرزد

---

[1] برناڈ لوئس۔ اسلام، جلد اول، نیویارک، ۱۹۷۴ء، ص XVIII

ہوئی ہے کہ وہ مسلم سلاطین پر بے وجہ قدیم ساسانی بادشاہوں کی روایات کا اثر دکھاتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ سلاطین ہند عظیم عباسی خلفاء کی شان و شوکت سے متعلق روایات کو اپنا آئیڈیل بناتے تھے۔ لیکن عباسی خلفاء کی طرح ان کو دینی قیادت کا مقام حاصل نہیں تھا۔ اب یہ مقام علماء کے لیے مخصوص تھا۔ اسی طرح سلطان قانونِ شریعت کی توجیہ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ یہ حق فقہاء کا تھا۔[1] درحقیقت سلطان کو اس معاملہ میں علماء سے مصالحت کرنی پڑتی تھی۔ مزید برآں سلطان کو رائے عامہ کا احترام کرنا بھی ضروری تھا۔ لہٰذا ساسانی یا قدیم غیر مسلم بادشاہوں کی طرح وہ عوام سے قطعی علیحدگی (Isolation) اختیار نہیں کرسکتا تھا۔ کم سے کم دہلی سلطنت کی تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ صرف وہی سلاطین کامیاب اور مقبول ہوئے جو اپنے فرائض کی انجام دہی کامیابی سے کرسکے۔ جو مروجہ روایات پر عمل پیرا رہنے میں ناکام رہے، انھیں بعض اوقات تخت و تاج کیا اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔

مذکورہ بالا پس منظر میں ہم تیرہویں صدی عیسوی کے ہندوستان میں فارسی زبان میں تاریخ نگاری کی ابتداء اور اس کے ارتقار کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ کس طرح مورخین نے قدیم اسلامی روایات کو مدِنظر رکھ کر تاریخی واقعات کو بیان کیا ہے اور تاریخ سے متعلق ان کے نظریات، مذہبی معتقدات اور اُن کی ذاتی پسند اور ناپسند کہاں تک اُن کے اظہارِ خیال (Approach) پر اثرانداز ہوئے ہیں؟

تاریخ پر اس دور کی سب سے پہلی کتاب محمد بن منصور کی شجرۂ انساب ہے جن کو عام طور پر فخر مدبر کے لقب سے پکارا جاتا تھا، مولف نے اپنی اس تالیف کو ۱۲۰۶ء کے بعد سلطان قطب الدین ایبک کے نام معنون کیا۔ مولف خود اور اس کے خاندان کے لوگ پشتوں سے غزنی میں سلطان محمود غزنوی اور اس کے جانشینوں کے دربار سے منسلک رہے۔ ۱۱۵۲ء میں غزنی پر غز ترکوں کی یورش اور تسلط پر جب غزنوی دربار لاہور منتقل ہوا تو فخر مدبر اور اس کے ضعیف باپ بھی لاہور آکر مستقل طور پر سکونت پذیر ہوگئے تھے۔ لاہور ہی میں فخر مدبر نے ارادہ کیا کہ وہ اپنے خاندان اور نسب سے متعلق شجرہ مرتب کرے۔

---

[1] علماء نے سلطان کو غیر معمولی حالات میں سلطنت اور امن و امان کے دشمنوں کو سزا دینے کا اختیار ضرور دے دیا تھا لیکن عام طور پر تمام مقدمات قاضی کی عدالت ہی میں شرعی قانون کے مطابق طے ہوتے تھے۔

لیکن اسی دوران میں اس کو اکابرینِ اسلام کا شجرہ مکمل کرنے میں دلچسپی ہوگئی لیکن لاہور میں تمام تاریخی لٹریچر خاص طور پر اس کے اپنے خاندان سے متعلق کاغذات دستیاب نہیں ہوسکے اس لیے کام نے طوالت اختیار کی۔ جب ۱۱۶۱ء میں سلطان غیاث الدین محمد بن سام نے غزنویوں کو غزنین سے نکال کر وہاں اپنے بھائی سلطان معزالدین محمد بن سام کو حکمراں بنادیا تو امن وامان قائم ہوا اس کے بعد فخرمدبر کو موقع ملا کہ وہاں پہنچ کر اپنے خاندانی کاغذات اور ضروری لٹریچر اکٹھا کرکے لاہور لائے۔ اس طرح بیس سال کی مدت میں ۱۲۰۶ء میں شجرۃ الانساب پایۂ تکمیل کو پہنچا اسی سال سلطان معزالدین محمد بن سام کی شہادت کے بعد جب ملک قطب الدین ایبک لاہور میں سلطان بنا تو فخرمدبر نے نئے سلطان کی ابتدائی زندگی، اس کی تعلیم وتربیت اخلاقی خوبیاں اور ہندوستان میں فتوحات کی مختصر تاریخ مرتب کرکے شجرۃ الانساب میں مقدمہ کی صورت میں شامل کیا اور اسے نئے سلطان کی خدمت میں پیش کیا تاکہ کتاب کے توسط سے اس کی دربار شاہی میں رسائی ہوسکے۔

متن اور تفاصیل کی نوعیت کی بنا پر اس مقدمہ کو ہم ہندوستان میں فارسی زبان میں لکھی گئی پہلی اہم تاریخ کہہ سکتے ہیں۔ اس کے اوراق میں ہمیں عظیم فاتح قطب الدین ایبک کی جامع اور مکمل تصویر ملتی ہے۔ مقدمہ کی اس اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے انگریز اسکالر سر ای، ڈینی سن اوس نے اس کو شجرۃ الانساب[1] سے الگ کرکے تصحیح اور انگریزی میں مقدمہ کے ساتھ ۱۹۲۷ء میں لندن سے شائع کیا۔[2]

دستورِ زمانہ کے مطابق کتاب کسی بھی موضوع سے متعلق ہو اگر اس کو دربار شاہی میں پیش کرنا ہوتا تو اس کے دیباچہ یا مقدمہ میں فرماں روائے وقت کی تعریف وتوصیف ضرور

---

[1] شجرۃ الانساب میں کُل ایک سو چھتیس[136] خاندانوں کے شجرے ملتے ہیں۔ نبی کریمؐ، صحابہ کرامؓ، انبیاء کرامؑ جن کا ذکر قرآن مجید میں ملتا ہے ان کے علاوہ قبل اسلام اور بعد از اسلام عرب شعراء قدیم ایرانی شہنشاہوں کے شجرے، اموی اور عباسی خلفاء کے شجرے اور پھر اخیر میں مسلم فقہاء اور سلاطین کے شجرے بھی ملتے ہیں۔

[2] ڈینی سن روس نے غلطی سے فخرمدبر کو بحرالانساب کے مولف فخرالدین مبارک شاہ مارورادی تصور کرکے مقدمہ کا نام تاریخ فخرالدین مبارک شاہ رکھ دیا۔ بعد میں مورخین نے اس غلطی کو واضح کرکے مقدمہ کو تاریخ فخرمدبر کہنا شروع کیا۔

کرنی پڑتی تھی۔ یہ تعریف و توصیف چند جملوں میں بھی کی جا سکتی تھی لیکن چونکہ فخر مدبر تاریخی شعور رکھتے تھے اور قطب الدین ایبک کی اعلیٰ صفات سے متاثر بھی تھے لہٰذا انھوں نے ایبک کے عہد پر مفصل تاریخ لکھی۔ یہ تاریخ (یعنی مقدمہ) اُن کے ایک کامیاب مورخ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اس میں مولف نے ایبک کی سوانح عمری سے متعلق انھیں واقعات کو اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے جن کی تاریخی اہمیت ہے۔ غیر تاریخی اہمیت کی تفاصیل کو چھوڑ دیا ہے۔ اس کے علاوہ اس سے ان تاریخی عوامل کی بھی اچھی طرح نشاندہی ہوتی ہے جو کہ مسلم فتوحات اور قطب الدین ایبک کے سلطان ہو جانے کے بعد کارفرما رہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ فخر مدبر کے بعد حسن نظامی اور منہاج الدین جوزجانی (یعنی منہاج سراج) نے ان عوامل کی نشاندہی نہیں کی ہے۔

تاریخ فخر مدبر کا آغاز حمد اور نعتیہ جملوں سے ہوتا ہے۔ نبی کریمؐ کے علاوہ اُن سے پہلے کے ان انبیاءؑ کا ذکر بھی ہے جن کا قرآن نے تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد گنبد نیلوفری، سات آسمانوں اور سیاروں کا ذکر ہے اور ان کو اللہ تعالیٰ کی شان اور عظمت کی نشانی بتایا ہے[1]۔ بعد ازاں سلطان اور اُس کے وجود کو روئے زمین پر امن و امان اور انسانی ارتقار کا ضامن ثابت کرنے کی غرض سے کہتے ہیں کہ معاشرے میں نظم و ضبط اور شریعت کا نفاذ سلطان ہی کے وجود سے ممکن ہے۔ اس ضمن میں سلطان اور سلطنت کی مذہبی حیثیت ثابت کرنے کے لیے ضعیف احادیث نقل کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر حدیث ہے کہ نبی کریمؐ نے فرمایا: "جو میری فرماں برداری کرتا ہے وہ اللہ کی فرماں برداری کرتا ہے اور جو سلطان کی فرماں برداری کرتا ہے وہ میری فرماں برداری کرتا ہے"۔ یا پھر دوسری حدیث ہے: "اگر سلاطین نہیں ہوں گے تو لوگ ایک دوسرے کو نگل جائیں گے"[2]۔

مذکورہ بالا احادیث سے یہ باور ہوتا ہے کہ فخر مدبر سے پہلے کے مسلم دانشوروں نے سیاسی اغراض کی بنا پر سلطنت کو استحکام دینے کے لیے بہت سی روایات وضع کر کے انھیں رسول اللہؐ سے منسوب کر دیا تھا۔ فخر مدبر نے اُن ہی کو اپنی تالیف میں من و عن نقل کر دیا ہے سلطان کے فرائض سے متعلق مولف کا بیان تاریخ کے نقطۂ نظر سے بڑا اہم ہے کیونکہ

---

[1] تاریخ فخر مدبر۔ صد ۲-۴ [2] ایضاً۔ صد ۱۱-۱۳

اس سے اس امر پر روشنی پڑتی ہے کہ علماء اور مسلم دانشور سلطان کے فرائض اور ذمہ داریوں سے واقف تھے اور ہر نئے سلطان سے توقع رکھتے تھے کہ وہ اپنے سیاسی اور دینی فرائض کو سنجیدگی اور مستعدی سے انجام دے گا۔ سلطان کا سب سے پہلا فرض تھا کہ وہ سلطنت میں غیر جانبدارانہ طریقہ پر انصاف قائم کرے تاکہ اُس کے تحت کمزور اور طاقتور، غریب اور امیر میں کوئی امتیاز نہ برتا جائے۔ اس کے بعد باغی، بغاوت اور معاشرے میں امن و امان کے دشمنوں کا سدباب کرے، منکرات و بدعات کا خاتمہ کرے، شہروں اور قصبات میں مساجد اور مدارس تعمیر کرائے، شاہراہوں پر پُل کنویں اور رباط (سرائے) تعمیر کرائے، اہم مقامات پر قلعہ تعمیر کرائے تاکہ لوگوں کو ڈاکوؤں اور حملہ آوروں سے تحفظ میسر ہو سکے۔ اس کے علاوہ سلطان کا یہ بھی فرض تھا کہ وہ اپنے قلمرو میں ایسے حالات پیدا کرے کہ ان کے تحت کسان خوش حال ہو سکیں[1]

مولف کا ایک مقصد ہندوستان میں آزاد مسلم سلطنت کے بانی کی اخلاقی خوبیاں اور اس کی عدیم المثال، شجاعت، فوجی صلاحیت، فیاضی اور اولوالعزمی کو بیان کرنا تھا لہٰذا قطب الدین ایبک کے آقا سلطان معزالدین محمد بن سام کا ذکر ضمناً آتا ہے۔ لیکن اس مختصر ذکر میں بھی غزنین میں سلطان کے اہم کارناموں کا خاطر خواہ علم ہو جاتا ہے۔ مثلاً فخر مدبر لکھتے ہیں کہ غزنین اور اُس سے متعلق علاقہ میں غز ترکوں کے جبر و استبداد کی وجہ سے بچے کھچے لوگ مفلوک الحال تھے جس کی وجہ سے وہاں اچھے اچھے لوگوں میں ایک معمولی ہندوستانی غلام رکھنے کی بھی استعداد نہیں رہی تھی لیکن وہاں پر سلطان معزالدین محمد بن سام کے تسلط کے بعد امن و امان قائم ہوا اور علاقہ کی دوبارہ ترقی کے لیے راہ ہموار ہوئی۔ جلد ہی راستے محفوظ ہو گئے اور بیرونی ممالک سے تجار کے قافلے آنے لگے۔ اس تجارت کی بحالی کے بعد لوگوں کے پاس دوبارہ دولت اکٹھی ہونے لگی نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ ایک غلام بھی نہیں رکھ سکتے تھے اب اُن کے پاس گھوڑوں اور اونٹوں کے علاوہ کئی غلام اور کنیزیں نظر آنے لگیں۔ ان نیک کاموں کے انعام میں اللہ نے سلطان کو ایک خوش بخت اور نیک خصال غلام بخشا جو کہ ملک قطب الدین ایبک تھا[2]

---

[1] تاریخ فخر مدبر، صفحہ ۱۴ تا ۱۸ [2] ایضاً صفحہ ۱۹-۲۰

سلطان کے مختصر ذکر کے بعد مولف نے ملک قطب الدین ایبک کے حالات ذرا تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ منہاج سراج جوزجانی کی تالیف "طبقات ناصری" کے موازنہ سے پتہ چلتا ہے کہ آخرالذکر نے ایبک کے ابتدائی حالات لکھنے کے لیے تاریخ فخر مدبر سے استفادہ کیا تھا کیونکہ دونوں کی تفصیلات میں بڑی حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے۔ دونوں ہی نے ایبک کی عدل پسندی، داد و دہش اور فوجی اور عسکری صلاحیتوں کو یکساں طور پر سراہا ہے۔ فخر مدبر کے مطابق، قطب الدین نے سلطان بننے سے پہلے ہی سلطان معز الدین محمد بن سام کی غلامی میں اپنی فراخ دلی اور بلند حوصلگی کی بنا پر ہزاروں آزاد لوگوں کو احسان اور عنایات سے اپنا غلام (یعنی گرویدہ) بنا لیا تھا۔ ہمت اور فیاضی میں وہ لامثال تھا۔ ماضی کا کوئی بڑے سے بڑا سلطان اس کی برابری نہیں کر سکتا تھا۔ اس بیان کو مزید زور دار الفاظ میں پیش کرنے کی غرض سے وہ ایک بہت ہی مقبول روایت کو نقل کرتا ہے کہ سومنات کی فتح کی تعریف میں فرخی کا قصیدہ سن کر سلطان محمود غزنوی (م ۱۰۳۰ء) اس قدر خوش ہوا تھا کہ اس نے فرخی کو بیل دار (یعنی وہ بوجھ جو ہاتھی پر لادا جاتا ہے) خزانہ انعام میں دے دیا تھا۔ لیکن ایبک اس طرح خزانے بخشتا رہتا ہے کہ اگر تمام خزانے سونے کے ہو جائیں تو اس کی نظر میں اُن کی ذرّہ برابر اہمیت نہ ہوگی[1] یہی حالت اس کی خدا ترسی کی ہے۔ ایبک نے اپنی سیاسی مصلحت کے تحت کبھی کسی مسلمان کو قتل نہیں کرایا۔ عفو اور درگذر اس کی سیرت کی نمایاں خصوصیت ہے[2]

فخر مدبر ایبک کی فوجی مہمات اور فتوحات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ سپاہیوں کی ہمت افزائی کے لیے معرکۂ جنگ میں پیش پیش رہتے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی مضبوط اور ناقابل فتح قلعہ کا محاصرہ کیا ہو اور پھر وہاں سے ناکام لوٹے ہوں۔ فتح کے لیے وہ خود منجنیق[3] کی کارکردگی کی نگرانی کرتے ہیں۔ جب قلعہ فتح ہو جاتا ہے تو وہاں نظم و نسق قائم کرنا اپنی اولین ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ فوج اور کوتوال کو تعینات کرنے کے بعد مرکز کو لوٹتے ہیں[4]

ایبک کی فتوحات کے بعد ہندوستان میں اسلام کے فروغ کے لیے جو فضا قائم ہوگئی

---

[1] تاریخ فخر مدبر، ص ۵۲ [2] ایضاً ص ۵۳ [3] منجنیق مختلف سائز کے ہوتے تھے۔ ان کے ذریعہ بڑے بڑے پتھر یا آگ کے گولے قلعہ کی فصیل کو توڑنے اور قلعہ کے اندر لوگوں کو نقصان پہنچانے کے لیے پھینکے جاتے تھے۔ منجنیق کا استعمال ہندوستان میں مسلمانوں نے شروع کیا۔ [4] تاریخ فخر مدبر ص ۵۰-۵۱

تھی اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ ہندو سردار جو کہ ایبک کی اطاعت قبول کر لیتے ہیں اور جن کو محبت اور عنایات سے نوازا جاتا ہے اُن میں سے بہت سے دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اور ہر سال مشرف بہ اسلام ہوتے رہتے ہیں۔ اس طرح ہندوستان کے اُن شہروں اور قصبوں میں جہاں کبھی اسلام کا نام بھی نہ سنا گیا تھا وہاں مدرسے اور مسجدیں تعمیر ہو رہی ہیں اور وہ عالم اسلام کا حصہ بن گئے ہیں[1]

اگرچہ دوسرے معاصر مورخ حسن نظامی نیشاپوری نے قطب الدین ایبک کے کارناموں کو تفصیل سے بیان کیا ہے لیکن اُس کے مُسجّع اور مشکل اسٹائل کی وجہ سے ہند میں مسلم سلطنت کے بانی کی تصویر اس کے اصلی رنگ میں پوری طرح نمایاں نہیں ہو پاتی۔ عربی الفاظ، عربی جملوں اور اشعار کی بھرمار اور صنائع بدائع کی وجہ سے عبارت کا مفہوم ذرا مشکل ہی سے واضح ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے فخر مدبر ہر واقعہ کو بہت ہی سلیس اور دلچسپ پیرایہ میں بیان کرتے ہیں بہت سی رسوم جن کی سیاسی اعتبار سے بڑی اہمیت تھی ان کا ذکر بھی پوری طرح اس کتاب میں ملتا ہے۔ بعد کے مورخین اختصار کی خاطر ان رسوم کو بیان نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر بیعت عام سے متعلق روایت رسم کی شکل میں ایبک تک زندہ تھی۔ اس کی اطلاع صرف فخر مدبر ہی دیتے ہیں۔ قطب الدین ایبک کی تخت نشینی کے سلسلے میں وہ کہتے ہیں کہ جب ایبک سلطان معزالدین محمد بن سام کی شہادت کی خبر سن کر دہلی سے لاہور پہنچا تو سخت گرمی کا موسم تھا۔ راستہ میں گرمی اور پانی کی کمی کی وجہ سے لشکر، گھوڑوں اور اونٹوں کو بے انتہا پریشانی اٹھانی پڑی تھی۔ سب بے حال تھے۔ لیکن سلطان کی تخت نشینی کی وجہ سے سب خوش نظر آتے تھے۔ نئے سلطان کی دارالخلافہ لاہور میں آمد پر وہاں کے تمام لوگ سلطان کی بیعت کے لیے گھروں سے نکل آئے۔ ائمہ کرام، قاضیان شہر، معزز سادات، اہل صفہ (یعنی گوشہ نشین درویش) امراء و ملوک، عوام و خواص، سپاہی، تجار، وضیع و شریف، کمزور اور طاقتور سب جوق در جوق آ گئے اور اپنی وفاداری کا یقین دلایا[2] درحقیقت اس رسم کے بعد ایبک کی سلطنت کو مسلم سیاست

---

[1] تاریخ فخر مدبر۔ صفحہ ۲۶ [2] تاریخ فخر مدبر، صفحہ ۳۱

مذکورہ بالا رسم کو ہم بیعت عام کہہ سکتے ہیں۔ یہ ایک قدیم اسلامی روایت کے اثر کے تحت بدلی ہوئی سیاست میں بھی ضروری تصور کی جاتی تھی۔ اس کی طرف حسن نظامی نے بھی اشارہ کیا ہے لیکن اختصار کی خاطر منہاج سراج جزجانی نے نظر انداز کر دیا ہے۔

کے تحت قانونی جواز مل گیا تھا۔

اسی طرح فخر مدبر نے قطب الدین ایبک کی اصلاحات کا جو کہ اس نے سلطان بننے کے بعد نافذ کیں ذکر کیا ہے اور چونکہ اُن کا ذکر بعد کے تیرھویں صدی کے مورخین نے غیر ضروری سمجھ کر چھوڑ دیا ہے اس لیے فخر مدبر کی تاریخ مزید اہمیت کی حامل ہو جاتی ہے۔ یہ اصلاحات اس لیے بھی اہم ہیں کہ ان سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامی قانون دوسرے قوانین کے مقابلہ میں برتر اور فائق تر تھا اور کسی ملک کے نظم و نسق کو شریعت اسلامی کے تحت لانے میں عوام کو زیادہ فائدہ پہنچتا تھا دوسرے اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ سلطان قطب الدین ایبک کی حکمت عملی مذہب سے کس حد تک متاثر ہوئی تھی۔ فخر مدبر لکھتے ہیں کہ نئے سلطان نے وہ وظائف اور املاک جو علماء و فضلاء اور دوسرے مستحق لوگوں کے نام چلے آرہے تھے ان کو بذریعہ فرمان بحال رکھا۔ اس کے علاوہ بہت سے دوسرے مستحق لوگوں کو نئے وظائف دیئے۔ مزید برآں اپنے ذاتی خزانہ سے معقول رقم خیرات میں تقسیم کرنے کے لیے مقرر کی۔[۱]

ہندوستان کی ترقی اور خوش حالی کا دار و مدار زیادہ تر زراعت پر تھا لہٰذا سلطان قطب الدین ایبک نے کسانوں کی زراعت میں دلچسپی بڑھانے کے لیے کسانوں کو بھی مراعات دیں۔ مثال کے طور پر اس نے کسانوں کو حکام کی زیادتیوں سے نجات دلانے کی کوشش کی۔ فخر مدبر پرزور الفاظ میں بتاتے ہیں کہ سلطان کی فوج میں مختلف ملکوں کے امراء اور سپاہی تھے جیسے غوری، خراسانی، خلجی اور ہندوستانی ٹھاکر اور رانگان، لیکن ان میں سے کسی کی مجال نہیں تھی کہ کسان کے کھیت سے ایک پتی بھی لے لے یا اس کے گھر سے کھانا منگائے یا بکری یا مرغی طلب کرے۔ دوسرے اُس نے کسانوں سے جوال (یعنی لگان) لیا جاتا تھا اس پر بھی نظر ثانی کی۔ جو کسان (غالباً مسلم) پیداوار کا پانچواں حصہ (۱/۵) حکومت کو دیتے تھے ان سے عشر یعنی پیداوار کا دسواں حصہ (۱/۱۰) وصول کرنے کا حکم دیا اور جو زمانہ سابق سے عشر ادا کر رہے تھے اُن سے نصف عشر (یعنی پیداوار کا بیسواں حصہ) لینے کا حکم دیا۔ اسی طرح سے دوسرے قوانین اور ضوابط جن کا شریعت اسلامی کی رو سے کوئی جواز نہیں تھا ان کو رد کر دیا گیا۔ آگے چل کر مولف کہتے ہیں کہ ہر معاملہ میں سلطان سختی پر نرمی کو ترجیح دیتا ہے۔[۲]

---

[۱] تاریخ فخر مدبر صد ۳۳ تا ۳۵ [۲] تاریخ فخر مدبر صد ۳۳ تا ۳۴ =

آخر میں فخر مدبر ترکستان[1] (یعنی وسط ایشیا کے شمال کے قبائلی علاقہ) میں رہنے والے غیر مسلم ترکوں کی تعریف میں اُن کے طرز معاشرت اور مختلف ترک قبائل کے مابین تعلقات کو بیان کرتے ہیں۔ اس حصہ میں سب سے پہلے ترکوں کے علاقہ کا جغرافیہ بتاتے ہیں کہ اس کے مشرق میں چین کی سرحد ہے، مغرب میں اس کی سرحد ملک روم (یعنی مشرقی یورپ کا علاقہ) کی سرحدوں سے جا ملتی ہے جبکہ اس کے جنوب میں ہندوستانی پہاڑ (یعنی ہمالیہ واقع ہے۔ اس جنوبی علاقہ میں تبت اور چینی ترکستان کو شامل کیا ہے آج بھی ان دونوں علاقوں میں ترک نسل کے لوگوں کی اکثریت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بہت سی اشیاء کا بھی ذکر ملتا ہے جن کی مختلف ملکوں میں مانگ تھی اور تجار یہاں سے ان اشیاء کو دنیا کے مختلف ممالک میں لے جاتے تھے۔ خاص طور پر مشک تاتاری وتبتی، قیمتی کھالیں، چینی ریشم جیسے سنجاب بہت مشہور تھے[2]

فخر مدبر کا ترکوں کے متعلق یہ بیان بھی دلچسپ ہے کہ وہ ترک جو بحیثیت غلام مسلم ممالک میں لائے جاتے ہیں وہ دوسرے غیر مسلم لوگوں کے برعکس جب مسلمان ہو جاتے ہیں تو پھر کبھی ارتداد کے مرتکب نہیں ہوتے۔ دوسرے نو مسلم لوگوں کی طرح نہ تو ان کو قدیم وطن کی محبت اسلام سے کنارہ کشی اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہے اور نہ اپنے عزیز واقرباء کی یاد ہی ان کو ارتداد کی طرف لے جاتی ہے۔ وہ دل سے سچے مسلمان بن جاتے ہیں۔ یہ ترک اپنے

= یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ دورِ حاضر کے مورخین نے تیرھویں صدی عیسوی میں سرکاری لگان جو کہ کسانوں کی فصل پر لگایا جاتا تھا اس کی مقدار کے سلسلے میں لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔ مورلینڈ وغیرہ نے صرف سلطان علاء الدین خلجی کے زمانہ کے لگان پر بحث کی ہے کیونکہ جن مشہور ماخذ کو استعمال کیا جاتا ہے اُن میں صرف ضیاء الدین برنی نے علاء الدین خلجی کے عہد کے بارے میں اطلاع دی ہے۔ اگر مورلینڈ جیسے مصنفین تاریخ فخر مدبر کا مطالعہ کرتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ ایبک کے عہد میں لگان عشر اور خراج کی صورتوں میں وصول کیا جاتا تھا اور خراج ½ تھا چونکہ یہ حقیقت تھی اور اس کا تذکرہ فخر مدبر نے کر دیا تھا لہٰذا عہد وسطیٰ کے مورخین نے اس وقت تک اس کے بارے میں کچھ نہیں لکھا جب تک کہ اس میں غیر معمولی تبدیلی نہیں ہوئی۔

[1] ترکستان سے مراد وہ قبائلی علاقہ ہے جو کہ وسط ایشیا کی مسلم مملکتوں یعنی خوارزم، سمرقند بخارا اور خراسان سے علاحدہ غیر مسلم ترک قبائل کا مسکن تھا۔ آج کل یہ Outer Asia کے نام سے موسوم ہے۔

[2] تاریخ فخر مدبر۔ صفحہ ۳۸، ۳۹

قدیم آبائی وطن میں انسانی تہذیب کی برکتوں سے محروم اور افلاس میں رہتے ہیں۔ ان کے رسم و رواج بھی غیر تہذیب یافتہ ہیں۔ مثال دیتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ایک قبیلہ کا دستور ہے کہ اس کے مرد دریا کے ایک کنارے پر رہتے ہیں اور اُس کی عورتیں دوسرے کنارے پر سال میں ایک متعین رات کو عورتیں پایاب دریا کو عبور کرتی ہیں اور اس کنارے پر پہنچ جاتی ہیں جہاں مرد ہوتے ہیں۔ وہاں وصل ہوتا ہے اور جو عورت جس مرد کے ہاتھ لگتی ہے وہ اس کے ساتھ شب گزارتا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ کون کس کی ماں ہے اور کون کس کی بہن۔ اس رات کے بعد کوئی مرد عورتوں کے حصہ میں نہیں جاسکتا تھا۔ دستور کی خلاف ورزی پر کوئی بھی ہو اس کو ذلت کے ساتھ موت کی سزا ملتی تھی لیکن جب یہی غیر تہذیب یافتہ ترک مسلم ملکوں میں آتے ہیں تو راسخ العقیدہ مسلمان ہی نہیں بنتے بلکہ فوج اور حکومت میں اپنی صلاحیتوں کی بنا پر بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز ہوتے ہیں۔ امیر اور ملک ہی نہیں بنتے بلکہ سلطان کے مرتبہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ فخر مدبر کے مطابق ترکوں کو یہ امتیاز صرف اسلامی معاشرے ہی میں مل سکتا ہے[1]

غرضکہ فخر مدبر کے مقدمہ کو ہندوستان میں بارہویں صدی عیسوی کی آخری دہائیوں میں مسلم فتح اور اس کے بعد آزاد مسلم سلطنت کے بانی کی پہلی سرکاری تاریخ کہا جاسکتا ہے۔ لیکن دوسری سرکاری تاریخوں (official histories) کی طرح اس میں مبالغہ آرائی زیادہ نہیں ہے قطب الدین ایبک کی جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ ان کی بعد کی تاریخوں میں بھی ملتی ہیں۔ لیکن اس کی اصل اہمیت یہ ہے کہ اس سے ہندوستان میں فارسی زبان میں تاریخ نگاری کی روایت کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد دوسری تاریخ جس کا آغاز بھی قطب الدین ایبک ہی کے عہد میں ہوا وہ حسن نظامی نیشاپوری کی مشہور تالیف "تاج المآثر ہے" جس کا تفصیل سے ذکر ہم آئندہ کریں گے۔

---

[1] تاریخ فخر مدبر، صفحہ ۳۴ تا ۳۶

مشترک خاندانی نظام اور اسلام از مولانا سلطان احمد اصلاحی

صفحات ۵۶ ۔ آفسٹ کی حسین طباعت ۔ قیمت صرف ۶ روپئے

ناشر: مکتبہ تحقیق وتصنیف اسلامی ۔ پان والی کوٹھی ۔ دودھ پور ۔ علی گڑھ ۔ ۲۰۲۰۰۲

بحث ونظر

اسلام میں رفاہی خدمات کا تصوّر

سیّد جلال الدین عمری

انسان اس دنیا میں بعض بنیادی ضروریات اور فطری تقاضے لے کر پیدا ہوتا ہے۔ ان کے پورا کرنے میں اسے مختلف سطحوں پر خاندان، خیر خواہ افراد، رفاہی اداروں اور ریاست کا تعاون ملتا رہتا ہے۔ یہ تعاون بھرپور ہو تو اس کے وجود و بقا اور ترقی کے امکانات بڑھ جاتے ہیں، اس میں جس حد تک کمی ہو اس حد تک یہ امکانات بھی کم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ایک فرد کے ذاتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو بسا اوقات افراد اور اداروں کے تعاون میں کوئی بڑا فرق نہیں محسوس ہوتا، اس لیے کہ ان میں سے ہر ایک کا تعاون وقتی اور عارضی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر تعلیمی، معاشی اور طبی اداروں کی رفاہی خدمات کو لیجئے ایک طالب علم تعلیم سے فارغ ہو جائے تو اسکول اور کالج کا کام ختم ہو جاتا ہے، بے روزگار کو روزگار مل جائے تو معاشی اداروں کی ذمہ داری پوری ہو جاتی ہے۔ مریض کو ممکنہ طبی سہولتیں فراہم کرنے کے بعد ہاسپٹل اور شفاخانے اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ یہی کام کسی شخص کا خاندان یا اس کا کوئی خیر خواہ انجام دیتا ہے۔ لیکن اگر اس پہلو سے دیکھا جائے کہ رفاہی خدمات معاشرے کے مختلف طبقات بلکہ پوری آبادی کے لیے ہوتی ہیں تو ان کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے رفاہِ عام کے ہر کام میں فردِ واحد کے مفاد کی جگہ پورے معاشرے یا اس کے بڑے بڑے طبقات کا مفاد پیش نظر ہوتا ہے کسی شخص کو تعلیم دے کر سوسائٹی میں باعزت مقام تک پہونچانا خاص اس شخص کی خدمت ہے لیکن ایک اچھے اسکول کا چلانا جہاں سے بے شمار بچے علم و ہنر سے آراستہ ہو کر نکلیں ایک پوری نسل کی خدمت ہے۔ اسی طرح کسی بے روزگار کو روزگار پر لگا دینا ایک شخصی تعاون ہے لیکن کسی ایسے ادارے کا قیام جس سے بہت سے بے روزگاروں کا مسئلہ حل ہو ایک پورے طبقے کے ساتھ تعاون ہے رفاہی خدمات کسی فرد کو نہیں بلکہ معاشرے کو بحیثیت مجموعی

اوپر اٹھانے کے لیے ہوتی ہیں۔ یہاں دینی اور اصلاحی خدمات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ان کی اہمیت ان خدمات سے کہیں زیادہ ہے جو مادی مقاصد کی تکمیل کے لیے انجام دی جاتی ہیں۔

رفاہی خدمات افراد کے ذریعہ بھی انجام پاتی ہیں، عوامی ادارے بھی ان کے لیے کام کرتے ہیں، حکومتیں اپنے وسائل کا بڑا حصہ ان پر صرف کرتی ہیں۔ بعض اوقات ایک ایک فرد کے ہاتھوں بڑے بڑے رفاہی کارنامے انجام پاتے ہیں۔ رفاہی ادارے آج کی دنیا میں فلاح و بہبود کی جو مفید اور وسیع خدمات انجام دے رہے ہیں انھیں ہر شخص دیکھ رہا ہے اور وقت ضرورت فائدہ بھی اٹھا رہا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں انسان کی ہر بنیادی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ادارے موجود ہیں۔ ان میں سے بہت سے کام فلاحی ریاست کی ذمہ داریوں میں شامل ہیں۔ یہاں یہ بحث نہیں ہے ان کے حدود کیا ہیں کہاں کس کا دائرہ عمل ختم ہوتا ہے اور دوسرے کا شروع ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وسائل و ذرائع کے لحاظ سے دائرہ کار چھوٹا یا بڑا ہوتا چلا جائے گا۔ ان سب کے درمیان اشتراک و تعاون بھی ہو سکتا ہے اور ہونا ہی چاہیے اس سے بہتر اور مفید نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے۔

اسلام اپنے تمام احکام میں اصلاً فرد ہی کو خطاب کرتا ہے اس معاملے میں بھی اس نے اسی کو مخاطب بنایا ہے اس لیے کہ ادارے ہوں یا حکومت سب کی بنیاد فرد ہی ہے اور وہی ان کی ہیئت کی تشکیل کرتا اور ان کے مزاج کو بناتا ہے۔

انسان پر اپنے قریب ترین افراد کے حقوق عائد ہوتے ہیں اور معاشرے کے حقوق سے بھی وہ انکار نہیں کر سکتا۔ ان دونوں قسم کے حقوق کا ادا کرنا اس کے لیے ضروری ہے۔ ایک طرف بیوی بچوں، عزیزوں اور قرابت داروں کے مطالبات کا پورا کرنا بھی اس پر فرض ہے اور دوسری طرف وہ ان تقاضوں کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا جو معاشرے کے جز ہونے کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتے ہیں۔ کسی معاشرے کا بہترین فرد وہی ہے جو ان دونوں قسم کے تقاضوں کو سامنے رکھے اور ان کے پورا کرنے میں کوتاہی نہ کرے۔ ہر شخص کو اپنے قریب کے افراد سے محبت ہوتی ہے اور وہ دوسروں پر ان کو ترجیح دیتا ہے۔ یہ جذبہ فطری ہے اور ایک حد تک اس کی رعایت کرنا بھی صحیح ہے لیکن بعض لوگ معاشرے کو نقصان پہنچا کر بھی اپنے قریبی افراد کا فائدہ چاہتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ معاشرے کے بدخواہ ہیں۔ معاشرے کا خیر خواہ وہ شخص ہے جو اپنے قریب ترین افراد کی خاطر بھی معاشرے کو نقصان نہ پہنچائے اور ہر دم

اس کی بھلائی اس کے پیش نظر رہے۔ اسلام نے جہاں اس بات کی تاکید کی ہے کہ انسان اپنے قریب ترین افراد کے حقوق ادا کرے، وہیں اس کی بھی ترغیب دی ہے کہ وہ معاشرے کو فائدہ پہنچائے اور اس کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لیے کوشاں رہے۔

اسلام یہ جذبہ پیدا کرتا ہے کہ انسان اس طرح زندگی گزارے کہ اس کی ذات سے خیر کے چشمے جاری ہوں، اس کی جسمانی اور ذہنی صلاحیتیں اور مالی وسائل دوسرے انسانوں کے کام آئیں، اپنی حدِ استطاعت کے اندر وہ ان کی مادی اور اخلاقی مدد کرے، وہ گھر سے فتنہ و فساد پھیلاتا ہوا نہ نکلے بلکہ انسانوں کے خیر خواہ اور فلاح و بہبود چاہنے والے کی حیثیت سے سامنے آئے۔ وہ جہاں بیٹھے امن و سلامتی کا پیغام بکھیرتا رہے، دوسروں کی مشکلات کو دور کرے اور ان کی دینی اور اخلاقی اصلاح کی کوشش میں لگا رہے۔ اس کا اندازہ ایک حدیث سے ہو سکتا ہے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

ایاکم والجلوس علی الطرقات	راستوں میں بیٹھنے سے بچو۔ صحابہؓ نے عرض
فقالوا مالنا بدٌّ انما ھی مجالسنا	کیا کہ ہمارے لیے اس کے بغیر کوئی چارہ
نتحدث فیھا، قال فاذا ابیتم	نہیں یعنی بیٹھنا ہی پڑتا ہے۔ یہ ہماری مجلسیں
الا المجالس فاعطوا الطریق حقھا	ہیں ان میں ہم بات چیت کرتے ہیں۔ آپ
قالوا وما حق الطریق قال غض	نے فرمایا۔ اگر تم بیٹھنا ضروری سمجھتے ہو تو
البصر وکف الاذی ورد السلام	راستہ کا حق ادا کرو۔ صحابہؓ نے سوال کیا کہ
وامر بالمعروف ونھی عن	راستہ کا کیا حق ہے؟ ارشاد ہوا نگاہیں نیچی
المنکر[1]	رکھنا، ایذا رسانی سے بچے رہنا، سلام کا جواب
	دینا، معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا۔

یہ حدیث تھوڑے سے فرق کے ساتھ بعض اور صحابہ سے بھی مروی ہے۔ حضرت ابو طلحہؓ کی روایت میں 'سلام کا جواب دینا' کے بعد 'حسن کلام' کا ذکر ہے[2]۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں حدیث کے آخر میں 'ارشاد السبیل' کا اضافہ ہے[3]۔ اس کے معنی راستہ دکھانے کے

---

[1] بخاری، کتاب المظالم والقصاص، باب افنیۃ الدور والجلوس فیہا۔ مسلم، کتاب السلام باب من حق الجلوس فی الطریق رد السلام [2] مسلم حوالہ سابق۔

[3] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی الجلوس بالطرقات

ہیں۔ ایک اور روایت میں "تغیثوا الملھوف وتھدوا الضالّ" کے الفاظ ملتے ہیں[1]۔ یعنی راستہ میں جہاں تم بیٹھے ہو کسی کو فریاد کرتے دیکھو تو فریاد رسی کرو اور بھٹکنے والے کو راستہ دکھاؤ۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ معاشرہ کی طرف سے ایک مومن پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، اسے ان کا راستہ اور بازار میں، مجلسوں اور محفلوں میں ہر جگہ خیال رکھنا چاہیے۔ وہ دوسروں کی عفت و عصمت کا پاسباں ہے، اسے کسی پر بری نگاہ ڈالنے کی اجازت نہیں ہے، وہ دوسروں کی تکلیف دور کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے، اس کی ذات سے کسی کو کسی قسم کی اذیت نہیں پہونچنی چاہیے۔ جیسے آمد و رفت میں رکاوٹ ڈالنا، گندگی پھیلانا، راہ گیروں سے الجھنا اور بدزبانی کرنا۔ غرض راستہ میں ایذا رسانی کی اور بھی جو صورتیں ہو سکتی ہیں ان سب سے اس کا دامن پاک ہونا چاہیے۔ کوئی اس پر امن و سلامتی کی دعا بھیجے تو فوراً اسے اس کا جواب دینا چاہیے تاکہ وہ اس کی طرف سے اطمینان محسوس کرے۔ پھر یہ کہ وہ جہاں بیٹھے معروف کی تلقین کرے اور منکر سے روکے۔ اس سے معاشرہ میں نیکیوں کو فروغ حاصل ہوگا اور وہ برائیوں سے محفوظ رہے گا۔ جب کوئی شخص کوئی غلط قدم اٹھانے کا ارادہ کرے گا اسے محسوس ہوگا کہ سوسائٹی میں اس کا احتساب کرنے کی طاقت موجود ہے۔ راستہ کا یہ بھی حق ہے کہ آدمی بد زبانی اور تلخ کلامی کا مظاہرہ نہ کرے بلکہ اس کے انداز تخاطب میں شرافت اور پاکیزگی پائی جائے اور شیریں کلامی کے ساتھ ہر ایک سے پیش آئے۔ اس سے بازار کے بہت سے جھگڑے اور ہنگامے ختم ہو سکتے ہیں۔ مصیبت زدوں کی مدد کرنا اور بھٹکنے والوں کو راستہ دکھانا بھی اس کی ذمہ داری ہے۔

اس ایک حدیث سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام فرد کو معاشرہ کی مادی اور اخلاقی خدمت پر کس طرح ابھارتا اور اس کے اندر اس کا جذبہ بیدار کرتا ہے۔

رفاہی خدمات دو طرح کی ہوتی ہیں۔ بعض خدمات سوسائٹی کی عام ضرورتیں پوری کرتی ہیں، ان کا فائدہ کل آبادی یا اس کے بڑے طبقہ کو براہِ راست پہونچتا ہے۔ بعض خدمات وہ ہیں جو سوسائٹی کی خاص خاص ضرورتیں پوری کرتی ہیں، لیکن مجموعی طور پر ان سے بھی پوری سوسائٹی کو نفع پہونچتا ہے۔ اسلام نے دونوں قسم کی خدمات کی طرف توجہ

---

[1] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی الجلوس بالطرقات۔

دلائی ہے۔

پاکی صفائی کی تعلیم اور انتظام

رفاہی خدمات میں ایک خدمت یہ بھی ہے کہ لوگوں میں پاکی صفائی کا شعور بیدار کیا جائے، اس کی ضرورت اور اہمیت ذہن نشین کرائی جائے، گندگی اور غلاظت کے نقصانات واضح کیے جائیں اور اس سے نفرت پیدا کی جائے۔ چھوٹی بڑی آبادیوں میں صفائی کا اہتمام کیا جائے، اس سلسلے کے مسائل حل کیے جائیں اور اس بات کی کوشش کی جائے کہ لوگ گندگی میں رہنے پر مجبور نہ ہوں۔ ان سب باتوں کو مغرب کی دین سمجھا جاتا ہے حالانکہ اس معاملے میں اسلام نے مثالی کردار ادا کیا ہے۔ وہ گندگی سے نفرت اور پاکی صفائی سے محبت کا جذبہ ابھارتا ہے۔ اس کے لیے تعلیم و تربیت اور ترغیب و تشوق سے کام لیتا ہے۔ وہ نظافت و نفاست کا اعلیٰ ترین تصور دیتا ہے اور اس کے مطابق پورے معاشرہ کو تیار کرتا ہے۔[1]

راستہ سے تکلیف دور کرنا

کسی ملک کی معاشی اور مادی ترقی میں آمد و رفت کے ذرائع کا بڑا دخل ہے۔ جہاں راستے صاف ستھرے اور محفوظ و مامون ہوں، سفر کی دشواریاں کم سے کم تر ہوں اور زیادہ سے زیادہ سہولتیں اور آسانیاں پائی جائیں، وہاں ترقی کے مواقع بھی اسی تناسب سے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اسی مقصد کے لیے سڑکوں اور پلوں کی تعمیر ہوتی ہے، پرخطر راستوں کو سفر کے قابل بنایا جاتا ہے، نشانات راہ لگائے جاتے ہیں، ٹریفک کے قواعد و ضوابط وضع کیے جاتے ہیں، سفر کو حادثات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور مسافروں کو سہولت اور آرام پہونچایا جاتا ہے۔ موجودہ دور نے فضائی سفر کی راہیں کھول دی ہیں۔ اس کے بھی بہت سے مسائل ہیں اور ان کو حل کرنے کی کوشش بھی مسلسل ہو رہی ہے۔

راستہ کی بڑی بڑی دشواریوں کو دور کرنا اور سفر کو آسان بنانا دراصل ریاست کی ایک بنیادی ذمہ داری ہے۔ دنیا کی ہر فلاحی ریاست اس ذمہ داری کو قبول کرتی ہے۔ لیکن اس میں

---

[1] اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا مقالہ 'اسلام اور طہارت و نظافت' مطبوعہ سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ، اکتوبر۔ دسمبر ۸۵ء

افراد کا تعاون بہت ضروری ہے۔ جہاں افراد باشعور اور تربیت یافتہ ہوں، ان کے اندر خوفِ خدا ہو، انسانوں کی خیر خواہی اور ہمدردی کا جذبہ ہو، وہاں یہ کام آسان ہوتا ہے۔ ورنہ ہزار تدبیروں کے باوجود سفر دشواریوں سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ قدم قدم پر زحمتیں اور رکاوٹیں پیش آسکتی ہیں۔ بسا اوقات مسافر سنگین حادثات سے دوچار ہوسکتا ہے۔ ان سب باتوں کے تجربات رات دن ہوتے رہتے ہیں۔

اس طرح کی رفاہی خدمات کی ذمہ داری اسلام کے نزدیک بھی ریاست ہی پر عائد ہوتی ہے، لیکن اس میں فرد کو اس نے شریک کیا ہے اور اس کے کردار کی اہمیت کو نمایاں کیا ہے۔ اس نے فرد کو جن رفاہی خدمات کی صریح اور واضح الفاظ میں تعلیم دی ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ راستوں کو صاف رکھے اور ان پر جو رکاوٹیں ہوں انھیں دور کرے۔ اس سلسلہ کی بعض روایات یہاں پیش کی جارہی ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

الایمان بضع وسبعون او بضع	ایمان کی ستر سے اوپر یا ساٹھ سے اوپر
وستون شعبة فافضلها قول	شاخیں ہیں ان میں افضل اور برتر شاخ لا الٰہ
لا الٰہ الا اللہ وادناها اماطة	الا اللہ کا قول ہے اور ادنیٰ شاخ راستہ
الاذیٰ عن الطریق والحیاء شعبة	سے تکلیف کو دور کرنا ہے۔ حیا بھی ایمان
من الایمان[1]	ہی کی ایک شاخ ہے۔

---

[1] یہ روایت صحیح مسلم کی ہے۔ (کتاب الایمان، باب بیان عدد شعب الایمان) بخاری کے الفاظ میں بغیر کسی شک کے کہا گیا ہے۔ الایمان بضع وستون شعبة (کتاب الایمان، باب امور الایمان) یعنی ایمان کی ساٹھ سے اوپر شاخیں ہیں۔ مسلم کی ایک اور روایت میں بغیر شک کے الایمان بضع وسبعون شعبة کہا گیا ہے یعنی ایمان کی ستر سے اوپر شاخیں ہیں۔ یہ روایت ابوداؤد اور ترمذی وغیرہ میں بھی ہے۔ بعض شارحینِ حدیث کے نزدیک امام بخاری کی روایت قابل ترجیح ہے اس لیے کہ ساٹھ سے اوپر والی تعداد پر سب ہی روایتیں متفق ہیں لیکن بعض دوسرے شارحین نے ستر سے اوپر والی روایت کو ترجیح دی ہے اس لیے کہ اس میں جو اضافہ ہے وہ ثقہ راویوں کی طرف سے ہے۔ ان کا اضافہ ہمیشہ قبول کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو نووی: شرح مسلم ۱/۴۷
حدیث میں ایمان کی ساٹھ یا ستر سے کچھ زیادہ شاخیں بیان کی گئی ہیں۔ ان کو جمع کرنے کی کوششیں بھی ہوئی ہیں

خدا پر ایمان سے آدمی میں مخلوقِ خدا کو راحت پہونچانے کا جذبہ بیدار ہوتا اور پروان چڑھتا ہے۔ ایمان اگر صحیح معنی میں دل میں جاگزیں ہو تو آدمی کی کوشش ہوگی کہ اس کی ذات سے دوسروں کو زیادہ سے زیادہ نفع پہونچے۔ اسی کا ایک چھوٹا سا پہلو حدیث میں بیان ہوا ہے۔ کوئی بھی صاحبِ ایمان راستہ میں پتھر، کانٹے، کوڑا کرکٹ اور گندگی جیسی چیزیں جن سے لوگوں کو تکلیف پہونچتی ہے، برداشت نہیں کرے گا۔ بلکہ وہ انھیں ہٹا دے گا۔

حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

لقد رأیت رجلا یتقلب فی	میں نے ایک شخص کو جنت میں چلتے
الجنۃ فی شجرۃ قطعہا من	پھرتے دیکھا (جس کا خاص عمل یہ تھا کہ)
ظہر الطریق کانت تؤذی الناس[1]	اس نے راستہ میں موجود ایک ایسا درخت
	کاٹ دیا تھا جو لوگوں کو تکلیف دے رہا تھا۔

مطلب یہ کہ اس نے لوگوں کے راستہ سے ایک تکلیف دہ کو ہٹا دیا تو اس کے لیے جنت کی راہ آسان ہوگئی اور کسی رکاوٹ کے بغیر جنت کے سبزہ زاروں میں گھومنا اس کے لیے ممکن ہوگیا۔

حضرت ابوہریرہؓ ہی کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

بینما رجل یمشی بطریق وجد	ایک شخص نے راستہ چلتے ہوئے ایک
غصن شوک علی الطریق فاخرہ	خاردار شاخ دیکھی۔ اس نے اسے وہاں
فشکر اللہ فغفر لہ[2]	سے ہٹا دیا اللہ تعالیٰ نے اس کے اس
	عمل کی قدر کی اور اس کی مغفرت فرما دی۔

ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں:۔

مر رجل بغصن شجرۃ علی	ایک شخص راستہ سے گزر رہا تھا کہ اس نے

= ہیں۔ اس کا ایک اچھا سا خلاصہ حافظ ابن حجرؒ نے بیان کیا ہے۔ (فتح الباری: ۱/ ۴۰ - ۴۱) غالباً حدیث کا منشا یہ ہے کہ دین کی تفصیلات کو ساٹھ ستر سے زیادہ عنوانات کے تحت بیان کیا جا سکتا ہے۔ یہاں اعلیٰ اور ادنیٰ کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ اس موضوع پر امام بیہقی کی 'شعب الایمان' سب سے جامع کتاب ہے۔

[1] مسلم، کتاب البر والصلہ، باب فضل ازالۃ الاذی عن الطریق۔

[2] بخاری، کتاب المظالم، باب من اخذ الغصن ویلوذی الناس الخ۔ مسلم حوالۂ سابق۔

فظہر الطریق فقال واللہ لاخین هذا عن المسلمین لایوذیہم فادخل الجنۃ[1]

اس کے بیچ میں درخت کی ایک بڑی سی شاخ دیکھی۔ اس نے دل میں سوچا کہ خدا کی قسم میں اسے مسلمانوں کے راستہ سے ہٹادوں گا تاکہ وہ انھیں اذیت نہ دے۔ اس پر اللہ نے اسے جنت میں داخل کردیا۔

اوپر کی حدیث میں اس شخص کو جنت کا مستحق قرار دیا گیا تھا جس نے ایک ایسے درخت کو کاٹ دیا تھا جس سے لوگوں کو راستہ میں تکلیف ہو رہی تھی۔ لیکن اس حدیث میں صرف ایک شاخ کے کاٹنے پر اس کی بشارت دی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کی راہ سے چھوٹی سے چھوٹی تکلیف دور کرنا اور ان کو معمولی سے معمولی فائدہ پہونچانا بھی انسان کو جنت جیسی ابدی نعمت کا حق دار بناتا ہے۔

حضرت ابوبرزہ اسلمیؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی:۔

علمنی شیئاً انتفع بہ

آپ مجھے کوئی ایسی بات بتادیجئے جس سے فائدہ اٹھاسکوں۔

آپ نے ارشاد فرمایا:۔

اعزل الاذی عن طریق المسلمین[2]

مسلمانوں کے راستہ سے تکلیف دور کردو۔

گو ان احادیث میں صرف راستہ کی تکلیف دور کرنے کا ذکر ہے، لیکن جیسا کہ امام نووی نے لکھا ہے۔

فیہ التنبیہ علی فضیلۃ کل ما نفع المسلمین وازال عنھم ضررا[3]

ان سے مسلمانوں کو نفع پہونچانے اور ان کے ضرر اور نقصان کو دور کرنے والے ہر عمل کی فضیلت کی نشاندہی ہوتی ہے۔

---

[1] مسلم، حوالۂ سابق

[2] مسلم، حوالۂ سابق۔ ابن ماجہ، ابواب الادب، باب اماطۃ الاذی عن الطریق۔

[3] شرح مسلم ۳۲۸/۲ مطبوعہ ہند

اسی طرح یہ ہدایات مسلم معاشرہ کے پیش نظر دی گئی ہیں اس لیے ان میں مسلمانوں کے راستہ سے تکلیف دور کرنے کا ذکر ہے۔ ورنہ یہ ایک عام حکم ہے۔ کسی بھی انسان کے راستہ سے تکلیف کا دور کرنا کارِ ثواب ہے۔ چنانچہ ان ہی روایات میں سے بعض میں 'الناس' کا لفظ آیا ہے[۱] جو عام انسانوں کے لیے ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل فرماتے ہیں:۔

یمیط الاذیٰ عن الطریق	آدمی راستہ سے تکلیف دور کرتا ہے
صدقۃ[۲]	یہ بھی ایک صدقہ ہے۔

راستہ سے تکلیف دور کرنے کا جو ثواب بیان ہوا ہے، اس حدیث سے اس کی توجیہ ہوتی ہے۔ صدقہ کا مقصد مصیبت میں کسی کی مدد کرنا اور اسے راحت اور آرام پہونچانا ہے۔ راستہ کی تکلیف دور کرنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ مسافر کو تکلیف نہ پہونچے اور وہ صحیح سلامت آسانی کے ساتھ راستہ طے کرلے۔ اس لحاظ سے یہ اس پر ایک صدقہ ہے[۳]

راستہ کی تکلیفیں اور رکاوٹیں ہر طرح کی ہوتی ہیں۔ ان کو دور کرنا اور سفر کو آسان بنانا ایک دینی کام ہے اور مسلمان اس پر بہترین اجر و ثواب کی توقع کرسکتا ہے۔

سرائے اور ہوٹل تعمیر کرنا

اسی سے ملتی جلتی خدمت ہوٹلوں اور مسافرخانوں کی تعمیر ہے، جہاں مسافروں کو بہتر سہولتیں حاصل ہوں اور وطن سے دوری کی وجہ سے انھیں دقتوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی ایک روایت سے اس کا اجر و ثواب اور فضیلت ظاہر ہوتی ہے۔ رسول اللہؐ کا ارشاد ہے:۔

ان مما یلحق المومن من	مومن کے مرنے کے بعد بھی اس
عملہ وحسناتہ بعد موتہ	کے جن اعمال اور نیکیوں کا ثواب اسے
علما علمہ ونشرہ وولدا	پہونچتا رہتا ہے ان میں یہ چیزیں بھی

---

[۱] مسلم، حوالۂ سابق۔ ابوبرزہ اسلمیؓ کی روایت ان الفاظ کے ساتھ بھی آئی ہے۔ امط الاذیٰ عن طریق الناس۔ الادب المفرد: ۱/۳۲۴

[۲] بخاری، کتاب المظالم، باب اماطۃ الاذیٰ [۳] فتح الباری: ۵/۷۰

صالحا ترکه ومصحفا ورثه اومسجدا بناه او بیتا لابن السبیل اونهرا اجراه اوصدقة اخرجها من ماله فی صحته و حیاته یلحقه بعد موته[1]

داخل ہیں۔ وہ علم جس کی اس نے تعلیم دی اور پھیلایا، نیک اولاد جو اس نے چھوڑی (کیوں کہ اس کو نیکی کی راہ پر لگانے میں اس کی کوششوں کا بھی دخل تھا) قرآن شریف جس کا اس نے اپنے بعد کسی کو وارث بنایا۔ یا مسجد جو اس نے بنوائی، یا مسافر کے لیے کوئی مکان جو اس نے تعمیر کرایا یا نہر جو اس نے کھدوائی یا وہ صدقہ جو اس نے اپنے مال سے صحت کی حالت میں اپنی زندگی میں نکالا۔ اس کا ثواب اسے اس کے مرنے کے بعد بھی ملے گا۔

اس حدیث میں رفاہِ عام کے بعض خاص کاموں کا ذکر ہے اور انھیں صدقاتِ جاریہ کہا گیا ہے۔ ان میں مسافروں کے لیے مکان اور سرائے کی تعمیر بھی ہے۔ ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کے کاموں میں پیسہ صرف کرنا بہترین صدقہ ہے۔ حضرت ابوامامہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

افضل الصدقات ظل فسطاط فی سبیل اللہ[2]

صدقات میں بہتر صدقہ یہ ہے کہ اللہ کے راستہ میں خیمہ کا سایہ فراہم کیا جائے۔

اس حدیث میں مجاہدوں کے لیے خیموں اور چھول داریوں کے انتظام کرنے کا ثواب بیان ہوا ہے، لیکن اس ذیل میں تعلیم و تربیت، دعوت و تبلیغ اور حج و عمرہ جیسے دینی مقاصد کے لیے مراکز قائم کرنا اور عارضی بنانا بھی آسکتا ہے۔

---

[1] رواہ ابن ماجہ (باب ثواب معلم الناس الخیر) باسناد حسن والبیہقی ورواہ ابن خزیمۃ فی صحیحہ مثلہ (الترغیب والترہیب ص ۲۳)

[2] ترمذی، فضائل الجہاد، باب ماجاء فی فضل الخدمۃ فی سبیل اللہ۔ مسند احمد ۵/۲۷۰

پانی کا نظم کرنا

پانی زندگی کی بنیادی ضرورت ہے۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی صاف پانی کی فراہمی اور ضرورت کے مطابق فراہمی بڑا مسئلہ ہے۔ اسلام نے اس کی طرف جس طرح توجہ دلائی ہے اس کا اندازہ اوپر کی اس روایت سے ہوسکتا ہے جس میں بندگان خدا کے لیے نہر کی تعمیر کو صدقۂ جاریہ کہا گیا ہے۔

حضرت سعید بن عبادہؓ کی والدہ کا انتقال ہوا تو انھوں نے چاہا کہ ان کی طرف سے صدقہ وخیرات کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کون سا صدقہ سب سے اچھا ہے؟ آپ نے فرمایا کنواں کھدوا دو۔ چنانچہ انھوں نے اپنی ماں کے نام سے کنواں کھدوا دیا۔[1]

نہر اور کنواں کھدوانا پانی کی فراہمی کی ایک شکل ہے، جو قدیم زمانہ سے رائج ہے۔ موجودہ دور میں ٹیوب ویل اور نل لگائے جاتے ہیں، حوض اور ٹینک میں پانی جمع کرکے تقسیم کرنا بھی اس کی ایک صورت ہے۔ اس طرح پانی مہیا کرنے کی تمام اسکیمیں اس میں آسکتی ہیں۔ اور وہ سب اجر وثواب کی مستحق ہیں۔

زمین کو آباد کرنا

بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنانا اور اس میں مدد دینا بھی ایک رفاہی خدمت ہے۔ اس سے مجموعی طور پر پوری قوم اور پورے ملک کو فائدہ پہونچتا ہے۔ حکومت خود بھی غیر آباد زمینوں کو آباد کرکے اس کی آمدنی فلاح وبہبود کے کاموں میں لگا سکتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جو لوگ انھیں آباد کرنا چاہیں انھیں اس کی اجازت دی جائے اور آسانیاں فراہم کی جائیں۔ اسلام نے اس بات کی ترغیب دی ہے اور اسے کارِ ثواب بتایا ہے کہ بنجر اور افتادہ زمینوں کو قابل کاشت بنایا جائے۔ حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

---

[1] ابوداؤد، کتاب الزکوٰۃ، باب فی فضل سقی الماء۔ نسائی، کتاب الوصایا، باب فضل الصدقۃ عن المیت۔ اس روایت کے راوی حضرت سعید بن مسیبؒ اور حضرت حسن بصریؒ کی حضرت سعد بن عبادہؓ سے ملاقات ثابت نہیں ہے اس لیے یہ روایت حدیث کی اصطلاح میں منقطع ہے۔

من احیی ارضا میتة فله فیها اجرها وما اکلت العافیة منها فهو له صدقة له

جس نے کسی مردہ زمین کو زندہ کیا اسے اس کا اجر ملے گا اس سے ضرور مند مخلوق (انسان، جانور، پرندے وغیرہ) جو کچھ کھائے وہ سب اس کی طرف سے صدقہ ہے (اس کا اسے اجر ملے گا)

کسی افتادہ زمین کو آدمی اپنی محنت سے زرخیز بنائے تو اس کا فائدہ اصلاً اس کی ذات اور اس کے خاندان کو پہونچتا ہے، لیکن یہ محنت ایک جائز مقصد کے لیے کی جاتی ہے اس لیے وہ اجر وثواب کا مستحق ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی فرمادیا کہ اس سے خدا کی جو مخلوق بھی فائدہ اٹھاتی ہے وہ اس کی طرف سے صدقہ ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس محنت سے انسانوں کو اور پورے معاشرہ کو جو فائدہ پہونچے گا اس کا کتنا بڑا اجر ہوگا۔

موجودہ دور کی رفاہی حکومتیں بھی افتادہ زمینوں کو قابل کاشت بنانے میں سہولتیں فراہم کرتی ہیں۔ اسلام نے اس سے آگے یہ اقدام کیا کہ جو شخص اس طرح کی زمین کو آباد کرے اس پر اسے مالکانہ حقوق دے دئے۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

من احیی ارضا میتة فهی له[۲]

جس نے کسی مردہ زمین کو زندہ کیا وہ اسی کی ہے۔

یہی بات حضرت عمرؓ نے بھی فرمائی ہے[۳]۔

اس سلسلہ میں حسب ذیل ہدایات دی گئی ہیں تاکہ فرد کے حقوق اور معاشرہ کے مفادات کو نقصان نہ پہونچے۔

۱۔ کسی دوسرے کی زمین کو افتادہ قرار دے کر اس پر قبضہ نہیں کیا جائے گا۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

من اعمر ارضا لیست لاحد

جس نے کسی ایسی زمین کو آباد کیا جس کا

---

[۱] مسند احمد: ۳/۳۲۷ [۲] ترمذی، کتاب الاحکام، باب ماذکر فی احیاء الموات

[۳] موطا، کتاب الاقضیہ، باب القضاء فی عمارۃ الموات ورواہ البخاری تعلیقاً۔ کتاب الحرث والمزارعہ باب من احیی ارضا مواتا۔

فهو احق [1] کوئی مالک نہیں ہے تو وہی اس کا زیادہ حق دار ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی زمین کو آباد کرنے سے آدمی کا اس پر حق اسی وقت تسلیم کیا جائے گا جب وہ کسی دوسرے کی ملکیت نہ ہو۔ حضرت سعید بن زیدؓ کی روایت زیادہ واضح ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں۔

من احیٰ ارضا میتة فهی له — جس نے کسی مردہ زمین کو زندہ کیا وہ اسی کی ہے البتہ ظالم رگ (ظلم سے کی ہوئی کھیتی) کا کوئی حق نہیں ہے۔
ولیس لعرق ظالم حق [2]

مطلب یہ کہ غیر آباد زمین کو آباد کرنے والا اس کا مالک ہوگا، لیکن اس بہانہ سے دوسرے کی زمین پر قبضہ کرنا اور اس میں کاشت شروع کر دینا ناجائز ہے۔ یہ صریح ظلم ہے اور ظلم کی کسی حال میں اجازت نہیں ہے۔

اوپر کی اسی حدیث کے ذیل میں ذکر آتا ہے کہ ایک شخص نے دوسرے کی زمین میں کھجور کے درخت لگوا لیے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مقدمہ پیش ہوا تو آپ نے فیصلہ فرمایا کہ زمین اس کے مالک کی ہے اور جس کے درخت تھے اسے حکم دیا کہ وہ ان درختوں کو کٹوا کر لے جائے۔ چنانچہ درخت کٹوا دیے گئے [3]

اس سے فقہ کے اس جزئیہ کی تائید ہوتی ہے کہ کسی غیر آباد زمین کے مالک کا پتہ نہ چلے اور اسے آباد کر لیا جائے تو مالک کا پتہ چلنے پر زمین واپس کر دی جائے گی اور مالکِ زمین کا جو نقصان ہوا ہے اس کا آباد کرنے والا اس کی تلافی کرے گا [4]

۲۔ فقہ حنفی کی رو سے افتادہ زمین وہ ہے جو آبادی سے دور ہو۔ جو زمین آبادی سے قریب ہو، اس سے آبادی کے بہت سے مفادات وابستہ ہوتے ہیں، لہٰذا آبادکاری کے احکام اس سے متعلق نہ ہوں گے۔

---

[1] بخاری، کتاب الحرث والمزارعة، باب من احیٰ ارضا مواتا۔ [2] ابوداؤد، کتاب الخراج والفیٔ والامارة، باب احیاء الموات۔ ترمذی، ابواب الاحکام، باب ماذکر فی احیاء الموات

[3] ابوداؤد، حوالہ سابق [4] ہدایہ: ۴/ ۴۷۸

امام شافعی اور امام احمد وغیرہ فرماتے ہیں کہ غیر آباد زمین کو آباد کرنے کے لیے اسلامی ریاست کے سربراہ یا امام کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ جو بھی شخص اسے آباد کرے اس کا حق اس پر تسلیم کیا جائے گا لیکن امام ابوحنیفہؒ نے امام کی رائے کو ضروری قرار دیا ہے۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ جو زمین آبادی سے قریب ہو اس کے لیے تو امام کی اجازت ضروری ہے لیکن جو زمین دور ہو اس کے لیے اجازت کی ضرورت نہیں ہے[1]

۳۔ کسی نے زمین پر حد بندی کر لی اور تین سال تک اسے آباد نہیں کیا تو اسلامی ریاست اس سے زمین واپس لے لے گی اور دوسرے شخص کو دے دے گی۔ اس لیے کہ پہلے شخص کو زمین اس لیے دی گئی تھی تاکہ وہ اسے آباد کرے اور عشر و خراج کے ذریعہ مسلمانوں کو فائدہ پہونچے محض حد بندی کو زمین کی آبادکاری نہیں کہا جا سکتا[2]

اس کی تائید حضرت عمرؓ کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے۔

من عطل ارضا ثلاث سنین	جس نے زمین تین سال تک آباد کیے
لم یعمرھا فجاء غیرہ فعمرھا	بغیر چھوڑے رکھی اور کسی دوسرے نے آکر
فھی لہ[3]	اسے آباد کر لی تو وہ اسی کی ہوگی۔

۴۔ آبادکاری کے مفہوم میں کاشت اور کھیتی بھی ہے اور مکان کی تعمیر بھی۔ فقہ حنفی کی رو سے اس کے ابتدائی اقدامات بھی اس میں آتے ہیں[4]

۵۔ افتادہ زمین کو آباد کرنے کا حق مسلمانوں کی طرح ذمیوں کو بھی حاصل ہوگا[5]

غیر آباد زمینوں کو آباد کرنے کے سلسلہ میں اسلامی قانون میں بڑی تفصیلات موجود ہیں۔ یہاں اس کے صرف بعض پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

درخت لگانا

غذا، صحت اور تندرستی کے نقطۂ نظر سے درختوں کی اہمیت بہت واضح ہے۔ ان

---

[1] ملاحظہ ہو ہدایہ حوالۂ سابق۔ فتح الباری: ۵/۱۲

[2] ہدایہ حوالۂ سابق [3] فتح الباری: ۵/۱۴

[4] ہدایہ: ۴/۴۷۷ [5] ہدایہ: ۴/۴۷۷

سے صاف ستھری اور تازہ ہوا ملتی ہے، ٹھنڈا اور فرحت بخش سایہ وہ فراہم کرتے ہیں، بہت سے درختوں کے پھولوں اور پتوں میں انسانوں اور جانوروں کی غذا اور علاج ہے۔ ان میں وہ درخت بھی ہیں جو عمدہ اور نفیس پھل پیدا کرتے ہیں، جو بہترین غذائیت کے حامل ہیں اور جن کا بدل انسان کا پاس نہیں ہے۔ ان کی سوکھی لکڑی تعمیرات میں کام آتی ہے، ایندھن میں استعمال ہوتی ہے اور بھی بہت سے فائدے اس سے اٹھائے جاتے ہیں۔

جنگلات کے فوائد اور ان کے اثرات سے بھی ہم سب واقف ہیں۔ ان سے بارش بروقت ہوتی ہے، موسم میں مناسب اور خوش گوار تبدیلی آتی ہے، آلودگی اور کثافت دور ہوتی ہے۔ وہ سیلاب کے روک تھام کا بھی ذریعہ ہیں یہی نہیں، جنگلات کے اور بھی فوائد ہیں۔

زمین کی آبادکاری میں درخت لگانا اور باغات کا تیار کرنا بھی آتا ہے۔ احادیث میں الگ سے بھی اس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

مامن مسلم یغرس غرسا او	مسلمان جو پودا لگاتا یا کھیتی کرتا ہے اس
یزرع زرعا فیاکل منه طیر او	سے پرندے، انسان یا جانور کچھ کھاتے
انسان او بهیمة الاکان له به صدقة[1]	ہیں تو یہ اس کی طرف سے صدقہ ہے۔

اسی مفہوم کی ایک روایت صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے۔ اس کے الفاظ ہیں کہ آپ نے فرمایا:۔

مامن مسلم یغرس غرسا	مسلمان کوئی درخت لگاتا ہے تو اس سے
الاکان ما اکل منه له صدقة	جو کچھ کھایا جاتا ہے وہ اس کی طرف سے
وماسرق منه له صدقه	صدقہ ہے۔ (یہاں تک کہ) جو اس سے چوری
وما اکل السبع فهو له صدقة	ہو جائے وہ بھی) صدقہ ہے، جو جنگل کے
وما اکلت الطیر فهو لهو	درندے کھا جائیں وہ (بھی) صدقہ ہے،
صدقة ولا یرزؤه احد	پرندے جو کھائیں وہ بھی صدقہ ہے۔
الاکان له صدقة[2]	کوئی شخص اس میں سے کچھ لے لے تو وہ بھی صدقہ ہے۔

---

[1] بخاری، کتاب الحرث والمزارعة، باب فضل الزرع الخ

[2] مسلم، کتاب المساقاة والمزارعة، باب فضل الغرس والزرع

حضرت انسؓ کی حدیث کے ذیل میں حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:۔

وفی الحدیث فضل الغرس	اس حدیث میں درخت لگانے اور کھیتی
والزرع والحض علی عمارۃ	کرنے کی فضیلت بیان ہوئی ہے اور زمین
الارض۔	کو آباد کرنے کی ترغیب پائی جاتی ہے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ اس سے زرخیز زمین رکھنے اور اس میں قیام کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ اس سے ان غلط قسم کے زاہدوں کے خیال کی تردید ہوتی ہے جو ان کاموں کو ناپسند کرتے ہیں۔ بعض روایات سے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ان کاموں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے لیکن یہ اس صورت میں ہے جب کہ آدمی ان میں لگ کر دینی امور سے غافل ہو جائے۔[1]

حضرت معاذؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

من بنی بنیانا فی غیر ظلم	جس شخص نے کسی پر ظلم و زیادتی کیے بغیر
ولا اعتداء او غرس غرسًا فی غیر	کوئی عمارت بنائی یا ظلم و زیادتی سے بچتے
ظلم ولا اعتداء کان له اجر جار	ہوئے کوئی درخت لگایا تو اس کے لیے
ما انتفع به من خلق الله	جاری رہنے والا اجر ہے جب تک کہ اللہ تعالیٰ
تبارك وتعالیٰ۔[2]	کی مخلوق اس سے فائدہ اٹھائے۔

درخت لگانے یا باغات تیار کرنے کا کام انسان اپنے ذاتی فائدہ کے لیے بھی کر سکتا ہے اس کا بھی ثواب ہے، لیکن اگر یہی کام عام انسانوں کے فائدہ کے لیے ہو تو اس کا اجر و ثواب بھی اسی قدر زیادہ ہے۔ یہ صدقہ جاریہ کی ایک صورت ہے۔ یعنی آدمی کے مرنے کے بعد بھی اس کے لگائے ہوئے درخت سے جب تک لوگ فائدہ اٹھائیں گے اسے ثواب ملتا رہے گا۔ مسلم کی جو روایت ابھی گزر چکی ہے، اس میں 'الی یوم القیامۃ' کے الفاظ بھی آتے ہیں یعنی قیامت تک اسے اس کا ثواب پہونچتا رہے گا۔ ایک درخت لگایا جائے تو اس سے بہت سے دوسرے درخت وجود میں آسکتے ہیں۔ اسی طرح کسی چیز کی تھوڑی سی کھیتی مزید کھیتی کا سبب بن سکتی ہے۔ جب تک یہ باقی ہے ثواب جاری رہے گا اس لیے کہ خدا کی مخلوق اس سے

---

[1] فتح الباری: ۵/۳ [2] مسند احمد: ۳/۳۳۸

فائدہ اٹھاتی رہے گی۔ یہ سلسلہ قیامت تک دراز ہوسکتا ہے[۱]

ایک شخص نے دمشق میں حضرت ابو درداءؓ کو دیکھا کہ وہ درخت لگا رہے ہیں عرض کیا کہ آپ صحابی رسول ہیں اور اس (دنیاداری) میں لگے ہوئے ہیں حضرت ابو درداءؓ نے فرمایا اعتراض کرنے میں جلدی مت کرو۔ (یہ تو ایک کارِ ثواب ہے جس میں میں مصروف ہوں) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سنا ہے۔

من غرس غرسا لم یأکل	اگر کوئی شخص درخت لگائے اور اس
منه آدمی ولا خلق من خلق	کے پھل سے آدمی یا اللہ کی کوئی مخلوق
الله الا کان له صدقة[۲]	فائدہ اٹھائے تو یہ اس کے حق میں
	ایک صدقہ ہے۔

ان احادیث میں جو فضیلت بیان ہوئی ہے اس میں، راستہ میں سایہ دار درختوں کا لگانا، رفاہ عام کے لیے باغات تیار کرنا، پارک بنوانا اور جنگلات کا تحفظ اور ان کی دیکھ بھال بھی آسکتی ہے۔

مساجد کی تعمیر

مسجد اصلاً اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے بنائی جاتی ہے۔ اس کی تعمیر براہ راست عبادت میں تعاون ہے۔ لیکن دورِ اول میں مساجد عبادت کے علاوہ مسلمانوں کے تعلیمی، سماجی اور سیاسی مراکز کی بھی حیثیت رکھتی تھیں ـــــ گو ان کی یہ حیثیت اب بہت کچھ بدل چکی ہے ـــ اس لیے رفاہی خدمات کے ذیل میں ان کا ذکر ضرور کیا جاسکتا ہے۔ مسجد کی تعمیر کا ثواب حضرت عثمانؓ کی ایک روایت میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے۔

قال رسول الله صلی الله علیه	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
وسلم من بنی مسجد ابتغی	فرمایا کہ جس کسی نے اللہ کی رضا کی طلب
به وجه الله بنی الله له	میں کوئی مسجد بنائی تو اللہ تعالیٰ اس کے
مثله فی الجنة[۳]	لیے اسی طرح کا (گھر) جنت میں بنائے گا۔

---

[۱] نووی: شرح مسلم: ۲/ [۲] مسند احمد ۶/ ۴۴۴

[۳] بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب من بنی مسجدا، مسلم، کتاب المساجد، باب فضل بناء المساجد

مدارس کا قیام

قوموں کی ذہنی اور فکری تعمیر میں تعلیم بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس لیے کسی قوم میں جو رفاہی خدمات انجام دی جاتی ہیں ان میں تعلیم کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اسلام نے اس اہمیت کو تسلیم کیا اور اس کے فروغ کی پوری کوشش کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کی توسیع و اشاعت کو ایک دینی فریضہ قرار دیا اور ہدایت فرمائی کہ جو شخص دین کا جتنا کچھ بھی علم حاصل کرے اسے دوسروں تک پہونچائے۔ موجودہ دور میں علم کے فروغ کا بڑا ذریعہ تعلیمی ادارے اور درس گاہیں ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اس طرح کے ادارے الگ سے تو نہیں تھے، البتہ مساجد سے علم کی روشنی چاروں طرف پھیلتی تھی۔ وہاں تعلیمی مجلسیں ہوتی تھیں، علمی حلقے قائم تھے اور درس و تدریس کا فرض انجام پاتا تھا۔[1] بعد کے ادوار میں مسلمانوں نے تعلیمی ادارے قائم کیے۔ جہاں خالص دینی علوم کے ساتھ ان کی روشنی میں وقت کے افکار و نظریات کی بھی تدریس ہوتی تھی۔ ان اداروں نے امت کے بہت سے مفکرین اور مجتہدین پیدا کیے۔

شفاخانوں کا قیام

اسلام سے پہلے عرب میں لوگ اپنا علاج خود کرتے یا کراتے تھے۔ یہ ایک لحاظ سے ہر شخص کا ذاتی یا زیادہ سے زیادہ اس کا خاندانی مسئلہ تھا، جسے وہ اپنی طاقت اور وسائل کے لحاظ سے حل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ عوامی شفاخانوں یا اسپتالوں کا وجود نہیں تھا۔ اسلام کے آنے کے بعد بھی عرصہ تک یہی صورت حال رہی، لیکن اس نے خدمت کا جو جذبہ پیدا کیا، اس کے نتیجہ میں یوں کہنا چاہیے کہ اس طرح کے شفاخانوں کی بھی بنیاد پڑ گئی۔ رفیدہ نامی ایک صحابیہ کے بارے میں آتا ہے کہ انھوں نے مسجد نبوی کے پاس ایک خیمہ لگا رکھا تھا،

---

[1] اس کی کسی قدر تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا مقالہ، محمد عربیؐ کے علمی احسانات۔ مطبوعہ تحقیقات اسلامی جنوری۔ مارچ ۱۹۸۷ء

جس میں وہ محض ثواب کی خاطر جنگ میں زخمی ہونے والے ان افراد کی مرہم پٹی اور علاج کرتی تھیں، جن کی نگہداشت کرنے والا کوئی نہ ہوتا تھا۔ حضرت سعد بن معاذؓ جنگ خندق میں زخمی ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی قوم سے کہا کہ وہ انھیں اسی خیمہ میں رکھیں تاکہ وہ قریب رہیں اور عیادت کرنے میں آپ کو آسانی ہو۔[1]

اس سے وقت ضرورت دواعلاج کے لیے کیمپ لگانے کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ شفاخانے اسی ضرورت کو چونکہ مستقل طور پر پوری کرتے ہیں، اس لیے اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں کا ان کی تعمیر وترقی میں بڑا حصہ رہا ہے۔

رفاہی کاموں کے لیے وقف کی فضیلت

رفاہی کاموں کے لیے زمین، جائداد اور اپنی قیمتی چیزوں کے وقف کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ یہ ان کاموں کو جاری رکھنے کا ایک بہت بڑا ذریعہ بھی ہے اور وقف کرنے والے کے لیے صدقۂ جاریہ بھی۔ صدقۂ جاریہ سے متعلق بعض روایات اس سے پہلے گزر چکی ہیں۔ یہاں ایک اور حدیث پیش کی جارہی ہے۔ یہ حدیث حضرت ابوہریرہؓ نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

اذا مات الانسان انقطع	جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے
عنه عمله الامن ثلاثة	عمل کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے البتہ تین صورتیں

---

[1] ابن ہشام: سیرۃ النبی: ۲۵۸/۳۔ نیز ملاحظہ ہو فتح الباری: ۲۹۰/۷۔ حضرت سعد بن معاذؓ کا یہ واقعہ بخاری کی ایک روایت میں اس طرح بیان ہوا ہے۔ فضرب النبیؐ خیمة فی المسجد لیعود که من قریب (کتاب الصلوٰۃ، باب الخیمة فی المسجد) (رسول اللہؐ نے مسجد نبوی میں حضرت سعد کے لیے خیمہ لگوایا تھا تاکہ قریب سے عیادت کرسکیں) رفیدہؓ کا یہ خیمہ زخمیوں کی مرہم پٹی اور خدمت کے لیے تھا اور اسی میں حضرت سعدؓ رکھے گئے تھے اس لیے راوی نے غالباً اسے اس طرح بیان کیا ہے کہ یہ خیمہ گویا ان کے لیے لگا تھا۔ بخاری ہی کی ایک دوسری روایت میں اسے بنوغفار کا خیمہ کہا گیا ہے۔ کتاب المغازی، باب مرجع النبیؐ من الاحزاب حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ رفیدہ کے شوہر کا تعلق بنوغفار سے ہو اس وجہ سے اسے بنوغفار کا خیمہ کہا گیا ہو۔ فتح الباری: ۲۹۲/۷

الا من صدقة جارية او علم ينتفع به او ولد صالح يدعو له[1]	ایسی ہیں جن میں اس کے اعمال باقی رہتے ہیں اور اسے ثواب ملتا رہتا ہے۔ وہ یہیں صدقہ جاریہ، اس کا وہ علم جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں اور صالح اولاد جو اس کے لیے دعا کرتی رہتی ہے۔

امام نووی اس کی شرح میں فرماتے ہیں:۔

الصدقة الجارية وهي الوقف[2]	صدقۂ جاریہ سے مراد وقف ہے۔

مزید فرماتے ہیں:۔

فيه دليل لصحة اصل الوقف وعظيم ثوابه[3]	اس میں وقف کے صحیح ہونے اور اس کے ثوابِ عظیم کی دلیل موجود ہے۔

وقف کی مختلف شکلوں کا رسول اکرم صلی اللہ علیہ کے دور میں ثبوت ملتا ہے۔ ان میں سے بعض کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے۔

۱۔ اسلام نے فلاحی کاموں کا جو اجر و ثواب بیان کیا ہے اس کی طلب میں صحابہ کرامؓ نے اپنی بہترین اور محبوب ترین چیزیں وقف کر دیں۔

حضرت عمرؓ کو بطور غنیمت خیبر میں ایک زمین ملی (بعض روایات میں اس کا نام ثمغ آتا ہے) وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ خیبر میں جو زمین میرے حصہ میں آئی ہے اس سے نفیس اور قیمتی چیز مجھے کبھی نہیں ملی۔ میں اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں دینا چاہتا ہوں۔ ارشاد ہو کہ اس کی بہتر صورت کیا ہوگی؟ آپؐ نے فرمایا۔

ان شئت حبّست اصلها و تصدقت بها۔	اگر تم پسند کرو تو اس کی اصل وقف کر دو اور اس کی آمدنی کو صدقہ کر دو۔

حضرت عمرؓ نے آپ کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے اسے اس طرح وقف کیا۔

---

[1] مسلم، کتاب الوصیۃ، باب ما یلحق الانسان من الثواب بعد وفاتہ

[2] شرح مسلم: ۲/۴۱

[3] حوالۂ سابق

انه لا یباع اصلها ولا یوهب ولا یورث ، فی الفقراء و القربیٰ والرقاب وفی سبیل اللہ والضیف وابن السبیل لاجناح علی من ولیها ان یأکل منها بالمعروف اویطعم صدیقا غیر متمول فیه [1]

اس کی اصل نہ تو فروخت کی جائے گی اور نہ ہبہ کی جائے گی اور نہ کوئی اس کا وارث ہی ہوگا۔ اس کی آمدنی صدقہ ہوگی محتاجوں اور قرابت داروں پر (جو اس کے مستحق ہوں گے) غلاموں کے آزاد کرنے اور اللہ کے راستہ (جہاد) میں۔ یہ مہمانوں اور مسافروں پر بھی خرچ ہوگی۔ جو شخص اس کی دیکھ بھال کرے وہ معروف کے مطابق اس کی آمدنی سے خود بھی کھا سکتا ہے اور دوستوں کو بھی کھلا سکتا ہے، البتہ اس سے دولت جمع نہیں کرے گا۔

اس حدیث سے وقف کے جو احکام نکلتے ہیں وہ اس وقت زیر بحث نہیں ہیں۔ یہاں تو صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ عوامی فلاح و بہبود کے کاموں کے لیے بھی وقف ہوتا تھا اور یہ وقف اسی نوعیت کا تھا۔

۲۔ مسلمانوں کی دینی اور اجتماعی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے بعض صحابہ نے اپنی مشترک جائیداد وقف کر دی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہونچنے کے بعد جب مسجد (نبوی) کی تعمیر کا ارادہ فرمایا تو اس کے لیے جس جگہ کا انتخاب فرمایا وہ بنو نجار کی تھی۔ آپ نے ان کے ذمہ داروں کو طلب فرمایا اور اس کی قیمت دریافت کی۔ ان لوگوں نے عرض کیا۔

لا واللہ لا نطلب ثمنه الا للہ [2]

ہمیں اس کی قیمت نہیں چاہیے۔ خدا کی قسم ہم تو اس کی قیمت صرف اللہ تعالیٰ سے چاہتے ہیں۔

---

[1] بخاری، کتاب الوصایا، باب الوقف کیف یکتب۔ مسلم، کتاب الوصایا، باب الوقف

[2] بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب بل تنبش قبور مشرکی الجاہلیۃ الخ۔ مسلم، کتاب المساجد

اس طرح مسجد نبوی وقف کی زمین پر تعمیر ہوئی۔ اس سے استدلال کیا جاسکتا ہے کہ جو چیز ایک سے زیادہ افراد کی ملکیت ہو ان سب کی مرضی سے وہ وقف کی جاسکتی ہے[۱]

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی اجتماعی ضرورت یا رفاہی خدمت کی طرف توجہ دلائی اور وہ وقف کے ذریعہ پوری کردی گئی۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ جو شخص مسجد (مسجد نبوی) کی توسیع کے لیے فلاں زمین خرید کر دے تو اسے جنت میں اس سے بہتر زمین ملے گی۔ حضرت عثمانؓ نے یہ زمین اپنے پیسے سے خرید کر دے دی[۲]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کرکے جب مدینہ تشریف لائے تو وہاں میٹھے پانی کا ایک ہی کنواں تھا جسے بئر رومہ کہا جاتا تھا۔ آپ نے فرمایا جو شخص اسے خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کردے اور اس میں اس کا بھی اتنا ہی حصہ ہو جتنا ایک عام مسلمان کا ہوتا ہے تو اسے اس سے بہتر چیز جنت میں ملے گی۔ حضرت عثمانؓ نے اسے خرید کر وقف کر دیا[۳]

---

[۱] امام بخاری نے اپنی صحیح کی 'کتاب الوصایا' میں اس پر ان الفاظ میں باب باندھا ہے 'اذا وقف جماعة ارضا مشاعا فهو جائز'۔ یعنی اگر مشترکہ زمین اس کے مالک وقف کردیں تو یہ جائز ہے۔ واقدی کا بیان ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے زمین کے مالکوں کو قیمت دے دی تھی اور یہ دس دینار تھی۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اگر یہ ثابت بھی ہو جائے تو امام بخاری کا استدلال بہرحال صحیح ہوگا، اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو نجار کی پیش کش رد نہیں فرمائی تھی کہ اس کی ملکیت میں متعدد افراد شریک ہیں اور یہ وقف نہیں کی جاسکتی فتح الباری ۵/ ۲۵۸۔ ابن ہبیرہ نے لکھا ہے کہ اس بات پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے کہ مشترکہ چیز وقف کی جاسکتی ہے۔ الافصاح عن معانی الصحاح ۲/ ۵۲۔ اس موضوع پر فقہاء کے خیالات کے لیے ملاحظہ ہو نیل الاوطار ۶/ ۱۳۳۔ ابن قدامہ: المغنی ۵/ ۶۴۴-۶۴۳۔

[۲] ترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب عثمان، نسائی، کتاب الاحباس، باب وقف المساجد

[۳] حوالۂ سابق۔ ورواہ البخاری تعلیقا، کتاب المزارعہ، باب من رای صدقة الماء وهبته و وصیته جائزة بئر رومہ ایک روایت کے مطابق رومۃ الغفاری کا تھا۔ ان کی طرف منسوب ہوکر وہ بئر رومہ کے نام سے مشہور ہوگیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اسلام لے آئے تھے۔ حضرت عثمانؓ نے پینتیس ہزار درہم میں خرید کر اسے وقف کیا تھا۔ نووی: تہذیب الاسماء واللغات (القسم الثانی) ۱/ ۳۶۔ دوسری روایت یہ ہے کہ یہ ایک کنویں یا چشمہ کا نام تھا۔ اس کا مالک بنو غفار کا ایک شخص تھا۔ وہ ایک مُدّ (ایک چھوٹا پیمانہ) غلہ کے =

۴۔ میت کی طرف سے وقف کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند فرمایا تاکہ اس کا ثواب اسے برابر پہونچتا رہے۔ آپ کے دور میں اس پر عمل بھی ہوا۔ چنانچہ حضرت سعد بن عبادہؓ کا واقعہ ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میری والدہ (عمرہ بنت مسعودؓ) کا اچانک انتقال ہوگیا۔ اس وقت میں موجود نہیں تھا۔ اگر میں ان کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا انھیں اس کا ثواب ملے گا۔ آپ نے فرمایا ہاں ضرور ملے گا۔ انھوں نے عرض کیا۔

انی اشهدك ان حائطي المخراف صدقة عليها[1] — میں آپ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میرا فلاں پھل دار باغ میری ماں کی طرف سے صدقہ ہے۔

رفاہ عام کے کاموں کے لیے وقف کا رواج مسلمانوں میں ہر دور میں رہا ہے۔ اس سے ان کاموں کے جاری رکھنے میں بڑی مدد ملتی رہی ہے۔

رفاہی خدمات سے متعلق اسلام کی جو تعلیمات اوپر پیش کی گئی ہیں ان کی تکمیل بعض دوسری ہدایات سے ہوتی ہے۔

عوامی ملکیت کو نقصان نہ پہونچایا جائے

اسلام نے ایک طرف تو شجر کاری کی ترغیب دی ہے، دوسری طرف اس

= عوض ایک مشک پانی فروخت کرتا تھا۔ رسول اللہؐ نے اس سے کہا کہ تم مجھے یہ دے دو۔ جنت کا چشمہ تمہیں اس کے عوض میں ملے گا۔ اس نے عرض کیا کہ میرے اور میرے بچوں کے گزر بسر کا یہی ایک ذریعہ ہے۔ حضرت عثمانؓ کو اس کی اطلاع ملی تو انھوں نے مذکورہ بالا رقم میں اسے خرید کر وقف کر دیا۔ نیل الاوطار ۱۳۱/۶

[1] بخاری کتاب الوصایا، باب اذا قال ارضی او بستانی لله۔ بخاری کی ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت سعد بن عبادہؓ نے اپنی ماں کی نذر کے بارے میں دریافت کیا تھا کہ وہ انتقال کر گئیں اور نذر پوری نہ کر سکیں۔ آپ نے فرمایا تم ان کی طرف سے نذر پوری کر دو۔ کتاب الوصایا، باب مایستحب لمن توفی الخ۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ہو سکتا ہے حضرت سعدؓ نے اپنی ماں کی نذر اور ان کی طرف سے صدقہ، دونوں ہی باتوں کے بارے میں آپ سے دریافت کیا ہو۔ اوپر کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی ماں کی طرف سے باغ کا صدقہ کیا تھا۔ نسائی میں ہے کہ انھوں نے آپ کے مشورہ سے کنواں کھدوایا تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ ان کی ماں نے غلام آزاد کرنے کی نذر مانی تھی۔ فتح الباری: ۲۵۲/۵-۲۵۳۔ اس سلسلہ کی روایات کے لیے دیکھی جائے۔ نسائی، کتاب الوصایا، باب فضل الصدقة عن الميت۔

بات سے منع کیا ہے کہ کسی پھل دار یا سایہ دار درخت کو کاٹ دیا جائے۔ حضرت عبداللہ بن حُبشیؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔

من قطع سدرۃ صوّب اللہ راسہ فی النار	جس نے بیری کا کوئی درخت کاٹا اللہ تعالیٰ اسے سر کے بل جہنم میں ڈال دے گا۔

بیری کا درخت آدمی کی ملکیت ہو تو اسے کاٹ سکتا ہے اور ذاتی فائدہ بھی اٹھا سکتا ہے۔ یہ کوئی گناہ نہیں ہے۔ یہاں اس درخت کے کاٹنے پر وعید سنائی گئی ہے جو کسی کی ذاتی ملکیت نہ ہو اور جس سے عوام کا مفاد وابستہ ہو۔

امام ابوداؤد نے اس حدیث کی روایت کی ہے۔ وہ اس کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

من قطع سدرۃ فی فلاۃ یستظل بہا ابن السبیل والبہائم عبثا وظلما بغیر حق یکون لہ فیہا صوب اللہ راسہ فی النار[1]	جو شخص بیری کا وہ درخت کاٹے جو میدان میں ہو، جس سے مسافر اور جانور سایہ حاصل کرتے ہوں۔ یہ کاٹنا بے وجہ اور ظلم و زیادتی سے ہو اور جس درخت پر کسی کا کوئی حق نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اسے سر کے بل جہنم میں ڈال دے گا۔

اس سے یہ استدلال غلط نہ ہوگا کہ عوامی ملکیت کی کسی چیز کو نقصان پہونچانا گناہ کا باعث ہے۔ اس لیے کہ یہ خدا کی مخلوق کو اذیت اور تکلیف پہونچانے اور اسے جو راحت اور آسائش پہونچ سکتی ہے اسے ختم کرنے کے ہم معنی ہے۔ یہ حرکت اللہ تعالیٰ کے نزدیک سخت مبغوض اور ناپسندیدہ ہے۔

وہ وسائلِ حیات جو سب کی ملکیت ہیں

اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس زمین پر انسان کی ضروریات پوری کرنے کے

---

[1] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی قطع السدر۔ اس موضوع سے متعلق بعض اور روایات اور ان کے سیاق و سباق کے لیے ملاحظہ ہو۔ بیہقی: السنن الکبری: ۶/ ۱۴۰-۱۴۱

لیے جو ذخائر موجود ہیں اور جن کے پیدا کرنے میں کسی شخص کی محنت کا کوئی دخل نہیں ہے وہ سب کے لیے ہیں اور سب ہی ان سے فائدہ اٹھانے کا حق رکھتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

المسلمون شرکاء فی ثلاث فی الماء والکلاء والنار[1] — تین چیزوں میں سارے مسلمان شریک ہیں۔ پانی، چارہ اور آگ۔

اس حدیث میں پانی سے قدرتی چشموں، دریاؤں، ندیوں اور تالابوں وغیرہ کا پانی مراد ہے۔ اسی طرح جانوروں کا وہ چارہ جو جنگلوں اور میدانوں میں پایا جاتا ہے اس سے فائدہ اٹھانے کا سب کو حق حاصل ہے۔ آگ سے ایندھن میں کام آنے والی لکڑی اور آگ جلانے کا سامان چقماق وغیرہ مراد لیے گئے ہیں[2]۔

قومی اہمیت کے وسائل سب کے لیے ہیں

قومی اور ملکی اہمیت رکھنے والے وسائل حیات کسی فرد کی ملکیت نہیں ہوں گے، بلکہ ان سے سب کو فائدہ اٹھانے کے برابر مواقع حاصل ہوں گے۔ ابیض بن حمالؓ بیان کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ مارب (یمن کا ایک حصہ) میں نمک کی جو کان ہے وہ انھیں عطا کر دی جائے۔ آپ نے وہ کان انھیں دے دی۔ جب وہ واپس ہوئے تو ایک شخص (اقرع بن حابس) نے عرض کیا کہ آپ نے انھیں ایک ایسی کان عطا فرما دی جو پانی کے ذخیرہ کی طرح ہے۔ وہاں کا ہر شخص اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس پر آپ نے وہ کان ان سے واپس لے لی اور عوام کے فائدہ کے لیے وقف کر دی (ایک روایت میں آتا ہے کہ آپ نے انھیں اس کے عوض ایک زمین اور باغ عطا فرمایا)

ابیض بن حمالؓ نے ایک سوال یہ بھی کیا کہ 'اراک' (جس کے پتے اونٹ کے چارہ کے طور پر استعمال ہوتے ہیں) کے کس علاقہ کو حد بندی کے ذریعہ اپنی ملکیت میں لیا جا سکتا ہے۔ آپ

---

[1] یہ حدیث ابوداؤد میں ایک مہاجر صحابی سے مروی ہے۔ نام کی صراحت نہیں ہے۔ (کتاب البیوع، باب فی منع الماء) البتہ ابن ماجہ میں یہی روایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے آئی ہے۔ ابواب الرہون، باب المسلمون شرکاء فی ثلاث۔ ابوداؤد کی روایت صحیح ہے لیکن ابن ماجہ کی روایت میں ضعف ہے۔

[2] اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو نیل الاوطار: ۶/۴۹-۵۰

نے فرمایا۔ جہاں اونٹوں کے قدم نہ پہونچیں (یعنی جو آبادی سے دور ہو)[۱]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاست بھی اس طرح کا کوئی اقدام نہیں کرے گی کہ جن وسائل حیات سے عام لوگوں کا مفاد وابستہ ہے ان پر کسی ایک یا چند افراد کا قبضہ ہو جائے اور دوسرے ان سے محروم رہیں۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ حاکم وقت ایسی کوئی چیز کسی ایک فرد کو نہیں دے گا جس سے عام مسلمانوں کی ضروریات متعلق ہوں۔ جیسے نمک کی کانیں یا ایسے کنویں جن سے قرب وجوار کے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہوں[۲]

یہاں نمک اور پانی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں ضرورت کی اور چیزیں بھی آسکتی ہیں۔ علامہ ابن ہبیرہ نے لکھا ہے کہ ائمہ اربعہ کا اس پر اتفاق ہے کہ نمک والی زمین یا جس چیز میں بھی عام مسلمانوں منفعت ہے اس پر کسی مسلمان کا تنہا قبضہ کر لینا جائز نہیں ہے[۳]

ذاتی وسائل حیات میں بھی دوسروں کا حق ہے

قدرت کے خزانوں کو آدمی بعض اوقات اپنی ذاتی جدوجہد اور محنت سے بھی حاصل کرتا ہے۔ وہ اس کا مالک ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اس نے اپنی ضرورت کے لیے کنواں کھدوایا، نہر نکالی یا حوض اور ٹینک میں پانی کا ذخیرہ جمع کیا۔ اس سلسلہ میں ہدایت یہ ہے کہ اس سے دوسرے حاجت مندوں کو محروم نہ رکھا جائے۔ ایک حدیث میں اس بات پر سخت وعید سنائی گئی ہے کہ آدمی کے پاس فاضل پانی ہو اور وہ ضرورت مندوں کو ان کے استعمال کی اجازت نہ دے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین قسم کے انسانوں کے بارے میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز نہ تو انھیں دیکھے گا اور نہ ان سے بات کرے گا اور ان پر اس کا سخت عذاب ہوگا۔ ان میں سے ایک کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا:۔

رجل کان له فضل	ایک وہ شخص جس کے پاس راستہ میں
ماء بالطریق فمنعه من	(کنویں وغیرہ کی شکل میں) فاضل پانی تھا اور

---

[۱] ترمذی، ابواب الاحکام، باب ماجاء فی القطائع۔ ابن ماجہ، ابواب الرہون، باب اقطاع الانہار والعیون

[۲] ہدایہ: ۴/۴۷۸ [۳] الافصاح عن معانی الصحاح: ۲/۵۱

ابن السبیل [1]

اس نے مسافر کو اس سے فائدہ اٹھانے سے روک دیا۔

ایک دوسری روایت میں ہے۔

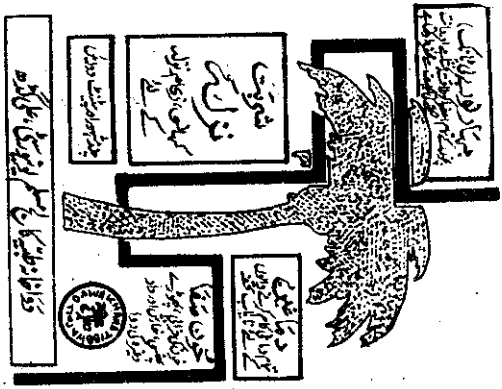
فیقول اللہ الیوم امنعك کما منعت فضل مالم تعمل یداك [2]

اللہ تعالیٰ قیامت کے روز فرمائے گا کہ آج میں تمہیں اپنے انعام سے اسی طرح محروم کردوں گا جس طرح کہ تم نے ایک زائد چیز کو، جس کے پیدا کرنے میں تمہاری کوشش کا کوئی دخل نہیں تھا، دینے سے انکار کر دیا تھا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام اس بات کی کس قدر تاکید کرتا ہے کہ آدمی کو جو وسائل حیات حاصل ہیں ان سے اپنی ضرورت پوری کرنے کے بعد دوسروں کی ضروریات کا بھی خیال رکھے۔

---

[1] بخاری، کتاب المزارعہ، باب اثم من منع ابن السبیل من الماء، مسلم، کتاب الایمان، باب تحریم اسبال الازار الخ [2] بخاری، کتاب المزارعۃ، باب من رای ان صاحب الحوض الخ آدمی کے پاس پانی کا ذخیرہ ہو تو اس کے لیے دوسروں کی حاجت کا پورا کرنا کس حد تک ضروری ہے، اس کی تھوڑی سی تفصیل کے لیے دیکھی جائے۔ فتح الباری: ۵/۲۱



اوقاتِ صلوٰۃ برائے اعلیٰ عرض البلد

ڈاکٹر طارق منیر

اوقاتِ صلوٰۃ

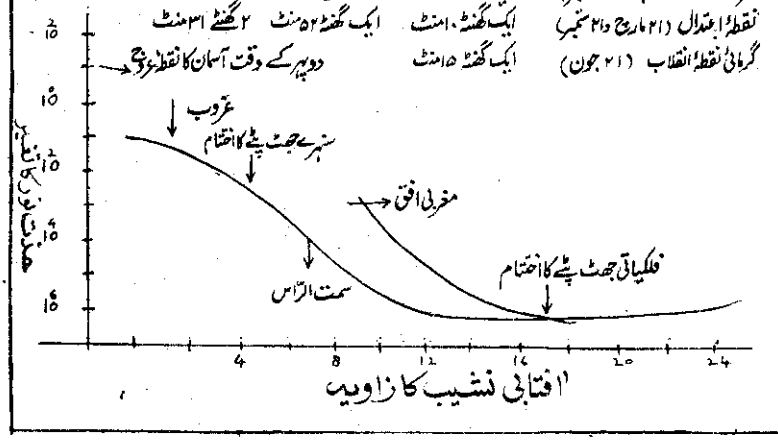
اوقاتِ صلوٰۃ ابتدا اور انتہا، دونوں کے بارے میں واقفیت اہلِ اسلام کے لیے بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ نمازوں کا ٹھیک وقت پر ادا کیا جانا نہایت ضروری ہے، ہر نماز کے لیے ایک وقت متعین ہے اسی کے اندر وہ ادا ہو سکتی ہے۔ نماز اور روزے کے اوقات جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خداوند تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق قائم فرمایا ہے، اساسی طور پر مشاہدات پر مبنی ہیں۔

منطقہ حارہ میں واقع ممالک کی حد تک "جھٹ پٹے" کا مشاہدہ چنداں مشکل نہیں ہے۔ اس لیے کہ مطلع صاف رہتا ہے اور گرما اور سرما کے نقطۂ انقلاب کے درمیان دن کا طول قابلِ لحاظ حد تک نہیں بدلتا۔ جھٹ پٹا دراصل دن کی روشنی کا وہ جزوی وقت دوران ہے جو قبل غروب و بعد غروب واقع ہوتا ہے۔ اس کا سبب مشاہد کی طرف آفتاب کے نور کا انعکاس اور انتشار ہے جو زمین پر فضا کے باعث اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ آفتاب مشاہد کے افق کے نیچے آجاتا ہے۔ غروب آفتاب کے بعد دن کی روشنی کی حدت میں جیسے جیسے آفتاب افق کے نیچے ڈوبتا جاتا ہے اور اس کی روشنی زیادہ اور کم کثافت والی ہوا سے منتشر ہونے لگتی ہے کمی پیدا ہونے لگتی ہے۔ جھٹ پٹے کے مختلف مرحلوں کے درمیان تمیز کی جا سکتی ہے۔ اس طرح شام کے وقت فلکیاتی جھٹ پٹا اس وقت ختم ہو جاتا ہے جب کہ سورج کا مرکز افق سے ۱۸° نیچے ہوتا ہے اور جب کہ دن کی روشنی کے آخری باقیات بھی نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ بحری جھٹ پٹا ختم ہو جاتا ہے جب کہ سورج کا مرکز افق سے ۱۲° ہی نیچے ہوتا ہے جب کہ شہری جھٹ پٹا سورج کے مرکز کا افق سے ۶° نیچے ہونے پر ہی اختتام کو پہونچ

جاتا ہے۔ یہ وقت کی وہ نچلی حد ہے جو سورج کی روشنی کے بیرونی مصروفیات کے لیے کارآمد ہونے کے کفایت کرتی۔ شکل (۱) مختلف مرحلوں پر جھٹ پٹے کی حدت میں کمی کو ظاہر کرتی ہے۔ جدول (۱) دیکھئے

جدول (۱) فلکیاتی جھٹ پٹے کا دوران

عرض بلد	خطِ استوا	۵۰° شمال	۴۸° جنوب
سرا کا نقطۂ انقلاب (۲۱ دسمبر)	ایک گھنٹہ ۱۵ منٹ	۲ گھنٹے ایک منٹ	۲ گھنٹے ۴۸ منٹ
نقطۂ اعتدال (۲۱ مارچ و ۲۱ ستمبر)	ایک گھنٹہ ۰ منٹ	ایک گھنٹہ ۵۲ منٹ	۲ گھنٹے ۳۱ منٹ
گرمائی نقطۂ انقلاب (۲۱ جون)	ایک گھنٹہ ۱۵ منٹ	دوپہر کے وقت آسمان کا نقطۂ عروج	



گرما کی مدت کے دوران (۲۱ مارچ تا ۲۱ ستمبر) قطب شمالی کے دائرے اور ۴۸° شمال کے درمیان ایک پٹہ ایسا ہوتا ہے جس میں کوئی حقیقی رات نہیں ہوتی اور جھٹ پٹا طلوعِ آفتاب سے غروب آفتاب تک پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ اس پٹہ کی چوڑائی اعظم ترین ہوتی ہے جس میں کوئی حقیقی رات نہیں ہوتی (یعنی دائری شمالی سے ۴۸° شمال تک) وسط گرما (۲۱ جون) پر اور اقل ترین نقاط اعتدال پر (یعنی ۲۱ مارچ اور ۲۱ ستمبر کو)۔ جدول (۲) اونچے عروض البلد پر "غیر معمولی" وقت دوران کو ظاہر کرتا ہے۔

جدول (۲)

شمالی عرض بلد (ڈگری میں)	حقیقی رات کے عدم وجود کی مدت
۵۰	۱۱ جون تا یکم جولائی
۵۱	۲۵ مئی " ۱۷ جولائی
۵۲	۲۱ مئی " ۲۴ جولائی

۵۳	۱۵ مئی تا	۲۷ جولائی
۵۴	۱۳ مئی "	۳۱ جولائی
۵۵	۹ مئی "	۳ اگست
۵۶	۵ مئی "	۹ اگست
۵۷	یکم مئی "	۱۱ اگست
۵۸	۲۹ اپریل "	۱۵ اگست
۵۹	۲۵ اپریل "	۱۷ اگست
۶۰	۲۱ اپریل "	۲۴ اگست

اوپر جو تفصیلات اور وضاحتیں پیش کی گئی ہیں ان میں بتایا گیا ہے کہ سطح زمین پر دن کی روشنی کے آخری باقیات فلکیاتی جھٹ پٹے کے خاتمے پر پہونچتے ہیں اور یہ اس وقت واقع ہوتا ہے جب کہ سورج کا نشیب افق سے ۱۸° پر ہوتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے بموجب عشاء کا وقت جھٹ پٹے کے خاتمہ پر شروع ہوتا ہے۔ صبح کے اوّلین اوقات میں صبح صادق کے آغاز پر سحر کا وقت ختم ہوکر فجر کا وقت شروع ہوتا ہے۔

اب جو سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ان مہینوں میں جب کہ کوئی حقیقی رات کا وجود ہی نہیں ہوتا اور جھٹ پٹا طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ عشاء کے آغاز اور فجر کے آغاز کے تعین کے لیے کیا معیار اختیار کیا جائے۔ اس تعلق سے ہم مولانا قاسمی صاحب کے ارشادات کو نقل کرتے ہیں جو انھوں نے اپنی کتاب "برطانیہ میں جھٹ پٹے کے صحیح اوقات" میں درج کیے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں "..... یہ سمجھ لینا چاہیے کہ نبی کریمؐ نے جن امور میں کوئی ٹھوس راہِ عمل کا تعین نہیں فرمایا ہے انھیں وہ اصول جن کو ابتدائی فقہاء نے اور بعد کے ماہرینِ اصولِ فقہ نے تدوین کیا ہے وہ محض تقریبی ہوں گے مطلق نہیں" بہرحال اونچے عرض البلد پر چوں کہ گرمی کے مہینوں میں حقیقی رات کا وقوع بھی نہیں ہوتا کوئی نہ کوئی حل خواہ کتنا ہی تقریبی کیوں نہ ہو دریافت کرنا ضروری ہے۔

حسب ذیل حل اس "غیر معمولی" مدت کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔

(۱) نزدیک ترین دن (اقرب الایام)

یہ اصول حنفی مکتب خیال کے فقہاء کا ہے۔ اس کی رو سے ان مقامات کے لیے جہاں جھٹ پٹا ختم نہیں ہوتا اس غیر معمولی مدت کے لیے

سحر کا وہی وقت دیا جائے گا جو اُس آخری دن تھا جبکہ جھٹ پٹا ختم ہوا۔ مثلاً ابرڈین میں وہ آخری دن جبکہ جھٹ پٹا رات میں ختم ہوا اور صبح (ایک بج کر ۲۰ منٹ پر) شروع ہوا ۳۰ اپریل ہے۔ اس لیے اس غیر معمولی مدت کے دوران (یعنی یکم مئی سے ۱۲ اگست تک) سحر کی حد ایک بج کر ۲۰ منٹ صبح ہوگی۔

(۲) نزدیک ترین عرض بلد (اقرب البلد)

یہ اصول شافعی مکتب خیال کے فقہاء کا ہے۔ اس میں ۴۸° عرض بلد پر جھٹ پٹے کے آغاز اور طلوعِ آفتاب کے اوقات کا فرق محسوب کیا جاتا ہے۔ یہی فرق سحر کے اختتام اور طلوعِ آفتاب کے درمیان اس مقام کے لیے ملحوظ رکھا جاتا ہے جہاں سحر کا وقت حساب کرنا ہوتا ہے۔

(۳) وسطِ شب (نصف اللیل)

یہ اصول متاخرین سے منسوب ہے۔ غروب آفتاب سے طلوعِ آفتاب تک کا وقت دو نصفوں میں بانٹ دیا جاتا ہے۔ پہلا نصف "رات" متصور ہوتا ہے اور دوسرا نہار۔

(۴) رات کا ۱/۷ حصہ، سبع من اللیل

یہ اصول بھی متاخرین کا ہے۔ غروب آفتاب اور طلوعِ آفتاب کے درمیان وقفہ کو سات حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس مدت کے ۱/۷ حصہ میں جو غروب آفتاب سے شروع ہوتا ہے اس بات کی سفارش کی جاتی ہے کہ لوگ سحری کھا سکتے ہیں۔ اس طرح طلوعِ آفتاب سے قبل رات کا ۱/۷ حصہ سحر کی مدت ہوگی۔ مثال کے طور پر ابرڈین میں ۶ مئی کو غروب آفتاب کا وقت ہے ۹ بج کر ۴۰ منٹ اور دوسرے دن طلوع آفتاب کا وقت ہے ۵ بج کر ۴۰ منٹ غروبِ آفتاب سے طلوع آفتاب تک کا وقت ۴۸۰ منٹ ہوتا ہے۔ اس کا ۱/۷ تقریباً ۶۹ منٹ ہوتا ہے۔ اس طرح ۷ مئی کو انتہائی وقت سحر ۳ بج کر ۵۵ منٹ ہوگا۔ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اس 'غیر معمولی' مدت کے دوران مذکورہ بالا چار اصولوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کی اصولِ فقہ اسلامی میں گنجائش رکھی گئی ہے تاکہ انتہائی وقتِ سحر اور ابتدائی وقت فجر کا تعین کیا جاسکے۔ ذیل میں "اوقاتِ صلوٰۃ" کے تعین کا اصول بیان کیا جائے گا۔

اختتام سحر اور آغازِ فجر کا وقت

جیسا کہ اوپر بحث کی جا چکی ہے کہ تمام نمازوں کے اوقات میں یہی ایک وقت اونچے عرض البلد پر حقیقی رات کے عدم وجود کے باعث سب سے زیادہ مشتبہ ہے۔ اس لیے کسی مقام کے لیے اوقاتِ صلوٰۃ اور اوقاتِ سحر کی سالانہ تقویم کی تیاری میں پہلا قدم "معمولی" اور "غیر معمولی" اوقات کا معلوم کیا جانا ہے (دیکھئے جدول ۲)

"معمولی" اوقات میں (ان دنوں جب بعد غروب سورج افق سے ۱۸° نیچے واقع ہوتا ہے اور پھر طلوع سے قبل افق سے ۱۸° نیچے ظاہر ہوتا ہے) سحر کے خاتمہ کا وقت وہی ہے جس پر فلکیاتی جھٹ پٹا ظاہر ہوتا ہے۔ البتہ "غیر معمولی" اوقات میں مذکورہ بالا چار اصولوں میں سے کوئی ایک اصول اپنایا جا سکتا ہے۔

وقتِ ظہر

وہی آن جب سورج مشرقی نصف کرہ سے مغربی نصف کرہ (زوال) میں حرکت کرتا ہے، وقتِ ظہر ہے۔ عام رواج یہ ہے کہ اصل وقت میں ۵ تا ۱۰ دقیقوں کا احتیاطاً اضافہ کر دیا جاتا ہے۔

وقتِ عصر

عصر کا وقت امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے مطابق وہ وقت ہے جبکہ ایک انتصابی ڈنڈے کا سایہ اس کے طول، جمع نصف النہار کے وقت کے سایہ کے برابر ہو۔ البتہ حنفی فقہاء کے نزدیک یہ وہ وقت ہوتا ہے جب کہ سایہ کا طول نصف النہار کے وقت کے سایہ جمع دو چند ڈنڈے کے طول کے برابر ہوتا ہے۔

وقتِ مغرب

یہ غروبِ آفتاب کا وقت ہوتا ہے۔

وقتِ عشاء

حنفی مسلک کی رو سے عشاء کا وقت فلکیاتی جھٹ پٹے کے اختتام سے شروع ہوتا

ہے۔ **شفقِ ابیض**: تمہید میں یہ بتلایا گیا ہے کہ یہ اس وقت ہوتا ہے جبکہ سورج کا نشیب اُفق سے ۱۸° پر ہوتا ہے۔ شافعی فقہاء کے نزدیک جو اصول، تسلیم شدہ ہے وہ یہ ہے کہ عشاء کی نماز اس وقت پڑھی جا سکتی ہے جبکہ غروبِ آفتاب کے بعد آسمان پر جو سُرخی چھا جاتی ہے وہ غائب ہو جائے۔

مولانا ظفر احمد تھانویؒ نے اپنی کتاب "اعلاء الاحکام" میں جو اردو میں لکھی گئی ہے آسمان کی سُرخی کے غائب ہو جانے کی بابت یوں لکھا ہے "..... شافعی اور دیگر ائمہ کے مطابق عشاء کا وقت، آسمان کی سرخی کے غائب ہونے پر شروع ہو جاتا ہے اور یہ غروب آفتاب کے ایک گھنٹہ گزر جانے کے بعد واقع ہوتا ہے"۔

ایک روسی طبعیات داں جی۔ وی روزن برگ نے 'جھٹ پٹے' کے عنوان پر ایک ضخیم کتاب لکھی ہے جس میں ان نتائج کو پیش کیا گیا ہے جو مختلف آفتابی نشیبوں اور ملحقہ آسمانی رنگتوں کی تبدیلیوں پر برسہا برس کے مشاہدات پر مبنی ہیں۔ روزن برگ نے واضح طور پر دکھلایا ہے کہ فلکیاتی جُھٹ پٹے کے آخری باقیات اس وقت ختم ہو جاتے ہیں جب سورج اُفق سے ۱۸° نیچے ڈوب جاتا ہے۔ "جُھٹ پٹے کے مظہر" کے تحت جو عنوان ہے، اس میں یہ لکھتا ہے "جب سورج اُفق سے ۱۰ تا ۵° کے نشیب پر آجاتا ہے تو بالائی فضاء کی اندرونی چمک کی نہیں ستاروں کی روشنی کے ساتھ ظاہر ہونے لگ جاتی ہیں اور روشنی کے بتدریج وہ حالات پیدا ہو جاتے ہیں جو رات سے موسوم ہیں۔ وہ آگے لکھتا ہے "بالآخر بحری جھٹ پٹا فلکیاتی جھٹ پٹے کو راستہ دیتا ہے جو اس وقت تک جاری رہتا ہے تا آنکہ سورج افق سے ۱۸° نیچے آکر بالآخر رات طاری ہو جاتی ہے۔ اس مدت کے دوران روشنی کے حالات بمشکل رات سے ممیز ہوتے ہیں اگرچہ کہ آسمان ابھی خاصہ روشن رہتا ہے جو فلکیاتی مشاہدات میں رکاوٹ بننے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ روزن برگ نے جُھٹ پٹے کی تخمین کردہ حدّوں کو بھی بیان کیا ہے جو مدنی جھٹ پٹے کے ختم پر (سورج کا نشیب ۶°)، بحری جھٹ پٹے کے ختم پر (سورج کا نشیب ۱۲°) اور فلکیاتی جُھٹ پٹے (سورج کا نشیب ۱۸°) پر واقع ہوتے ہیں۔ اس کے لیے علی الترتیب اعداد ہیں ۵-۲ لکس، ۰٫۰۰۶ لکس اور ۰٫۰۰۰۰۶ لکس ہیں۔ تقابل کے لیے دن کی روشنی کی حدّوں کو بھی نصف النہار اور بہ وقت غروب دیا جاتا ہے۔ یہ بالترتیب ۴۲۰۰۰ لکس اور ۲۴۰ لکس ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر جھٹ پٹے کی تنویر میں کمی غروب

آفتاب کے بعد ۴۰۰۰۰ گنا ہوتی ہے یا نصف النہاری آسمان کی ستر ملین گنا۔ اگرچہ کہ حدتِ نور میں کمی مذکور بالا واقعات میں عمل میں آتی ہے تاہم اس قابلِ لحاظ کمی کو انسانی آنکھ ایک لوکا رتمی دریافت کنندہ کی حیثیت سے پہچان جاتی ہے ایسے موقع پر ہم سب رب العزت کی حمد وثنا کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ فبای الاء ربکما تکذبٰن۔ روزن برگ نے آسمان کی سرخی کے مسئلہ کی بھی تحقیق کی ہے۔ اس نے طیف پیماؤں کے ذریعہ پیمائش کر کے بتلایا ہے کہ آفتابی افق ۱۳° یا اس سے زیادہ کے آفتابی نشیبوں پر سرخ ہو جاتا ہے۔ اس بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ جھٹ پٹے کے آخری باقیات اس وقت غائب ہو جاتے ہیں جبکہ سورج افق سے ۱۸° نیچے اتر آتا ہے اور سابقہ بحثوں کے نتائج کے پیش نظر کہ جھٹ پٹے کی حدت تنویر بحری (۱۲°) اور فلکیاتی (۱۸°) کی حدود میں گھٹتی ہے اس امر کی سفارش کی جا سکتی ہے کہ ۱۵° کے اطراف سورج کے نشیب کو "شفق احمر" کے تعین کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس مرحلہ پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ گرما کے مہینوں کی شدت کے دوران عشاء کے وقت کے تعین کا کیا معیار ہونا چاہیے جبکہ اونچے عرض البلد پر افق سے ۱۵° نیچے بھی غروب ہو نہیں پاتا؟ مثلاً ابرڈین کے عرض البلد پر ۲۱ مئی اور ۲۱ اگست کو سورج کا نشیب افق سے ۷°-۱۲ ہوتا ہے جبکہ ۲۱ جون کو اس کے متناظر جو نشیب ہے وہ ۴°-۹ کا ہے۔ ان حالات میں ڈیوزبری مسجد کے مولانا قاسمی نے عشاء کا وقت غروب آفتاب کے ایک گھنٹہ بعد تجویز کیا ہے۔ یہی وقت دور جدید کے ماہرین فقہ اسلامی نے بھی مقرر کیا ہے۔

شفق احمر کا اصول امام شافعی اور دیگر اماموں کا پیش کردہ ہے۔ ایک اور اصول بھی ان ہی حضرات سے موسوم ہے وہ یہ کہ مغرب کا وقت محدود ہے اور بنا بریں ختم ہو جاتا ہے اس مدت کے دوران جو اذان کے دیے جانے اقامت اور سات رکعتوں کی ادائی کے لیے درکار ہے۔

(انگریزی مقالہ کا اردو ترجمہ: ڈاکٹر سید محفوظ علی)

تشریح وتوضیح

جناب ڈاکٹر حسن الدین صاحب

جناب طارق منیر (عثمانیہ) اس وقت ابیرڈین یونیورسٹی میں میکانیکل انجینیرنگ کے لکچرر ہیں اور سورج سے توانائی ان کی تخصیص ہے۔

۱۹۸۰ء کے لگ بھگ ان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اوقات صلوٰۃ کو کمپوٹر ایا جائے۔ اوقات صلوٰۃ کا راست تعلق عرض البلد۔ طول البلد اور سطح سمندر سے اونچائی پر ہے۔ کمپوٹر پر ان معلوم باتوں (عرض البلد۔ اور سطح سمندر سے اونچائی) کی مدد سے ایک سکنڈ میں اوقات صلوٰۃ معلوم کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن کمپوٹرانے سے قبل ریاضی کے اصولوں کے تحت معلوم باتوں اور اوقات صلوٰۃ کے باہمی ربط کا فارمولا بنانا ضروری تھا اور اس کے لیے چند بنیادی باتوں کی ضرورت تھی۔ جناب طارق منیر کو تین سال تک یہ متعلقہ معلومات حاصل نہ ہوسکیں۔ ۱۹۸۳ء میں ان کو عبدالواسع صاحب پروفیسر دینیات وفلکیات جامعہ عثمانیہ کی مایہ ناز تصنیف "معیار الاوقات" کا پتہ چلا۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر دنیا میں واحد کتاب ہے۔ کسی اور زبان میں اتنا جامع کام نہیں ہوا۔ اس کتاب میں معلوم باتوں اور اوقات صلوٰۃ کے باہمی ربط کو جدولوں کی مدد سے متعین کیا گیا ہے۔ اس اہم اور مشکل میدان میں پروفیسر عبدالواسع صاحب کو بنیادی کام کرنے کی سعادت اس وجہ سے حاصل ہوئی کہ وہ بیک وقت فلکیات اور دینیات کے عالم تھے۔ ان کی تحقیقات لائق صد تحسین ہیں۔

جناب طارق منیر نے پروفیسر عبدالواسع کی کتاب کی مدد سے ۱۹۸۵ء میں ایک رسالہ Algorithum and Computer programme for prayer time کے نام سے شائع کیا جس کا اردو ترجمہ ۲۸ دسمبر ۱۹۸۶ء کے روزنامہ سیاست میں "تعین اوقات صوم و صلوٰۃ" کے عنوان کے تحت شائع ہوا۔

طارق منیر اسلامی دنیا کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے پروفیسر عبدالواسع کی کاوش سے انگریزی دانوں کو بھی استفادہ کا موقع فراہم کیا۔ لیکن موصوف نے اس سے آگے بھی ایسی سمت میں قدم اٹھایا جس پر علماء کی نظر ضرور تھی لیکن کوئی سائنٹفک حل موجود نہ تھا۔

پروفیسر عبدالواسع صاحب کی کتاب کی مدد سے ایسے مقامات کی حد تک اوقات صلوٰۃ معلوم نہیں کیے جاسکتے ہیں جو ۶۵½ عرض البلد (شمال) سے اوپر یا ۶۵½ عرض البلد (جنوب) سے نیچے واقع ہیں۔

اپریل ۱۹۸۸ء میں طارق منیر نے اپنی تحقیقات کو ایک علمی رسالہ کی شکل میں پیش کیا جس کا عنوان ہے Prayer timings for the Higher Latitudes یہ مختصر رسالہ تحقیقی نوعیت کا ہے۔ کوشش کی جائے گی کہ ان تحقیقات کو عام فہم انداز میں تحقیقاتِ اسلامی کے

قارئین کی خدمت میں پیش کیا جائے۔

½ ۴۷ عرض البلد (شمالی) سے اوپر اور ½ ۴۷ عرض البلد (جنوبی) سے نیچے کے مقامات کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ ان مقامات پر سورج کے غروب ہونے کے بعد بھی روشنی کی موجودگی کی وجہ سے شرعی رات نہیں ہوتی اور صلوٰۃ عشاء کا وقت نہیں آتا۔ یہ ایک شرعی دشواری ہے۔ یہیں پر ہمارے علماء فقہ کی علم کی گہرائی اور وسیع معلومات کا اندازہ ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ (۷۰۰ء تا ۷۶۷ء) اور امام شافعیؒ (۷۶۷ء تا ۸۱۹ء) اس دشوار صورتِ حال سے نہ صرف یہ کہ واقف تھے بلکہ ہر دو نے اس دشواری کا شرعی حل بھی پیش کیا۔

یہاں ایک قانونی اصطلاح کی وضاحت ضروری ہے جس کو ہمارے فقہاء نے بھی تسلیم کیا ہے اس کو Doctrine of Cypres کہتے ہیں۔ یعنی شرعی احکام کی تعمیل میں حالات اور مقام کے لحاظ سے کوئی دشواری پیش آئے تو اس سے قریب ترین مقام کے احکام کی پابندی کی جائے۔ مثلاً اگر کسی نے کچھ رقم وقف کی کہ اس سے فلاں جگہ مسجد تعمیر کی جائے اور بعد میں اس جگہ کے حصول میں قانونی موانعات پیدا ہو جائیں یا یہ محسوس کیا جائے کہ وہاں مسلمانوں کی آبادی نہ ہونے کے باعث مسجد کی تعمیر مناسب نہیں تو Doctrine of Cypres کے تحت کسی قریبی مقام پر جہاں یہ موانعات نہ ہوں مسجد تعمیر کی جا سکتی ہے۔ انتہائی شمالی اور انتہائی جنوبی مقامات پر شرعی رات نہ ہونے اور صلوٰۃ عشاء کا وقت نہ آنے کی دشواری کو ہر دو ائمہؒ نے اسی اصول Doctrine of Cypres کے تحت حل کیا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ نے اس غیر معمولی صورت حال میں قریب ترین دن (اقرب الایام) کا حل پیش کیا ہے۔ یعنی اگر ابرڈین میں یکم مئی سے صلوٰۃ عشاء کا وقت نہ آنے کی دشواری لاحق ہوتی ہے تو امام ابوحنیفہؒ کی فقہ کے مطابق ابرڈین میں ۳۰ اپریل کے اوقاتِ صلوٰۃ کو معیار بنا کر ان کی پابندی کی جائے گی۔

امام شافعیؒ نے اس دشواری کا حل Doctrine of Cypres ہی کے تحت یہ پیش کیا کہ جس مقام پر عشاء کی نماز کا وقت، نہ آنے کی دشواری پیش آتی ہے وہاں اس سے قریب ترین ایسے مقام کے اوقات کی پابندی کی جائے جہاں یہ دشواری لاحق نہیں ہوتی گویا اقرب البلد کا اصول پیش کیا۔ مثلاً ابرڈین میں یہ دشواری لاحق ہوتی ہے تو ابرڈین سے قریب ترین ایسے مقام کی پابندی کی جائے گی جو ½ ۴۷ عرض البلد پر واقع ہوں۔

اس کے علاوہ متاخرین علمار فقہ نے بھی دو حل پیش کیے۔ ایک حل یہ ہے کہ سورج کے غروب اور طلوع کے درمیانی وقفہ کو دو مساوی حصوں میں تقسیم کرکے ایک حصہ کو رات اور دوسرے کو دن تصور کیا جائے اور اس تقسیم کے بموجب اوقات صلوٰۃ کا تعین کیا جائے۔

مولانا ظفر علی تھانوی نے بھی اسی طرح کا ایک حل پیش کیا جس میں غروب آفتاب اور طلوع کے درمیانی وقفہ کو سات حصوں میں تقسیم کرکے پہلے چھ حصوں کو رات اور ساتویں حصہ کو دن شمار کیا جائے اور اس کے بموجب اوقاتِ صلوٰۃ کا تعین کیا جائے۔

ادارۂ تحقیق

کی مطبوعات کے علاوہ دوسرے مکتبوں کی دینی کتب بھی آپ ہم سے طلب کرسکتے ہیں۔ بعض کتابوں کے نام یہاں دئے جارہے ہیں۔

۱۔	بخاری شریف اردو ترجمہ کمل ۳ جلدوں میں	۳۰۰/-	۱۵۔	معاشیات اسلام	مولانا مودودیؒ ۲۵/-
۲۔	مسلم شریف اردو ترجمہ ۶ جلدوں میں	۳۰۰/-	۱۶۔	سود	مولانا مودودیؒ ۱۸/-
۳۔	مشکوٰۃ المصابیح اردو ترجمہ کمل ۳ جلدوں میں	۱۹۵/-	۱۷۔	یہودیت و نصرانیت	" ۳۰/-
۴۔	تذکرہ	مولانا ابوالکلام آزاد ۶۰/-	۱۸۔	خلافت و ملوکیت	" ۳۰/-
۵۔	غبار خاطر	" ۴۰/-	۱۹۔	معروف و منکر	مولانا جلال الدین عمری ۳۵/-
۶۔	خطبات آزاد	" ۵۰/-	۲۰۔	خدا اور رسول کا تصور	" ۳۰/-
۷۔	مسلمان عورت (ترجمہ)	" ۲۰/-	۲۱۔	عورت اسلامی معاشرے میں	" ۲۵/-
۸۔	عزیمت و دعوت	" ۸/-	۲۲۔	قرآن مجید کا تعارف	مولانا صدرالدین اصلاحی
۹۔	اصحاب کہف	" ۸/-	۲۳۔	دین کا قرآنی تصور	"
۱۰۔	انتخاب الہلال	" ۳۵/-	۲۴۔	اسلام - ایک نظر میں	" ۱۵/-
۱۱۔	اسلامی فقہ	مولانا منہاج الدین میناٹی ۷۰/-	۲۵۔	تحریکِ اسلامی ہند	"
۱۲۔	یادِ رفتگاں	ماہر القادری ۴۰/-	۲۶۔	زادِ راہ	مولانا جلیل حسن ندوی ۳۰/-
۱۳۔	الجہاد فی الاسلام	مولانا مودودیؒ ۴۰/-	۲۷۔	سفینۂ نجات	"
۱۴۔	سیرت سرورِ عالم	" اول ۶۰/- دوم ۸۵/-	۲۸۔	اسلام کا تصور مساوات	مولانا سلطان احمد اصلاحی ۲۰/-

ملنے کا پتہ

مکتبہ تحقیق و تصنیف اسلامی - پان والی کوٹھی - دودھ پور - علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

ترجمہ وتلخیص

ترکی اور مشرقی عرب میں عربی چھاپے خانے کا قیام*

مترجم: ابوسفیان اصلاحی

عربی چھاپے خانے کے حقیقی موجد کا نام ابھی تک پس پردہ ہے، لیکن اتنا طے شدہ ہے کہ عربی چھاپے خانے کی ایجاد فانو (اٹلی) میں ہوئی لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ اس حقیقت کی طرف امریکن انسائیکلو پیڈیا، انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا، چیمبرز انسائیکلو پیڈیا، دی نیو کولمبیا انسائیکلو پیڈیا، دی یونیورسل انسائیکلو پیڈیا آف نیس، ورلڈ یونیورسٹی انسائیکلو پیڈیا اور انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے ماسوا ان تمام انسائیکلو پیڈیاز میں ہمیں صرف ایک وینس پرنٹر عبدس مینوٹیوس (۱۵۱۵ — ۱۴۵۰) کا ذکر ملتا ہے، اس نے پہلی بار یونانی حروف ابجدی کے مکمل ٹائپ کا ڈیزائن تیار کیا اور اسے ڈھالا۔ اس نے وینس میں چھاپے خانے کی بنیاد ڈالی اور ۱۵۰۱ء میں پہلی بار اٹیلیک ٹائپ کا استعمال کیا۔ عربی چھاپے خانے کے اصل موجد کے بارے میں اختلاف رائے سے قطع نظر کسی حد تک اس کی ایجاد کا سہرا پوپ جولیس (۱۵۱۳ — ۱۴۴۳) کے سر ہے[۱]۔ اس نے اس کی سخت ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے بعض لوگوں کو اس کے ایجاد کی ہدایت کی اور اس طرح عربی چھاپے خانے کا قیام عمل میں آیا اور ۱۵۱۴ء میں جولیو دہم (۱۵۲۱ - ۱۴۷۵) کے دور حکومت میں اس کام کا آغاز ہوا[۲]۔ اس کا سب سے پہلا مظہر دعا کی ایک کتاب کا جو کتاب السواعیہ کے نام سے معروف ہے ۱۵۱۴ء میں چھپنا تھا اور وہ ابھی تک موجود ہے[۳]۔

۱۵۱۶ء میں زبور کی اشاعت ہوئی۔ یہ اس کی دوسری طباعت تھی، قرآن کریم کی طباعت بھی بندوقیہ میں عمل میں آئی[۴] لیکن یہ نسخہ اس اندیشے سے ضائع کر دیا گیا کہ اس کی

---

* اصل مضمون انگریزی کے مشہور مجلہ "اسلامک کلچر" (جنوری ۱۹۸۶ء) میں شائع ہوا ہے۔ مضمون نگار ڈاکٹر مقصود احمد بڑودہ یونیورسٹی بڑودہ کے شعبۂ عربی میں لکچرر ہیں۔

زد عیسائی عقائد پر پڑ سکتی ہے۔[۵] دو اور کتابیں ابن سینا کی "القانون" (۱۵۹۳ء) اور ادریسی کی "نزہۃ المشتاق" اسی زمانے میں منظرِ عام پر آئیں۔ مذکورہ بالا چھاپے خانوں کے علاوہ دوسرے بہت سے چھاپے خانے وجود میں آئے اور ان سے ہزاروں کی تعداد میں عربی کتابیں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئیں۔[۶]

سولہویں صدی کے وسط میں آستانہ (ترکی) میں عربی چھاپے خانے کی شروعات ہوئی۔[۷] لیکن یہ چھاپے خانے ایک طویل عرصہ تک راسخ العقیدہ مسلم علماء کی حمایت حاصل نہ کر سکے، خلافتِ عثمانیہ کی طرف سے جب محمد الجالبی کو پیرس کا سفیر مقرر کیا گیا تو اس وقت ۱۷۲۸ء میں ایک عظیم پریس قائم کرنے کا موقع ہاتھ آیا، اب علماء سے اس کے جواز کا فتویٰ لینے میں بھی کامیابی حاصل ہوگئی۔ پہلے تو علماء کرام نے صرف غیر مذہبی کتابوں کی طباعت کا فتویٰ دیا۔ لیکن بعد میں انھوں نے فنِ طباعت کی افادیت کے پیشِ نظر مذہبی کتابوں کی طباعت کے حق میں بھی فتویٰ نافذ کر دیا۔ اس طرح دن بدن چھاپے خانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ اور بہت سی اہم کتابوں کی طباعت عمل میں آئی۔ بیشمار کتابوں کی اشاعت کے ساتھ ساتھ ۱۸۱۴ء میں مجد الدین کی "القاموس المحیط" (۱۸۱۹ء میں) ابن الحاجب کی "الکافیہ" اور ان کے علاوہ دوسری اور چالیس کتابیں طباعت کے مرحلے سے گزریں۔ ان اہم چھاپے خانوں کے ساتھ ہی ۱۸۱۶ء میں بمقام قسطنطنیہ ایک چھاپہ خانہ اور غالباً ۱۸۶۱ء ہی میں "مطبعۃ الجوائب" کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس پریس سے ہفتہ وار اخبار "الجوائب" منظرِ عام پر آیا۔ جس کے مرتب احمد فارس شدیاق (۸۸ — ۱۸۰۳ء) تھے۔ اس کے علاوہ بہت سی عربی کتابیں بھی شائع ہوئیں۔

مشرقِ عرب میں سب سے پہلے عربی چھاپے خانے کا ظہور قزحیا Qazhayy کی خانقاہ میں ہوا۔ روم سے یہاں چھاپہ خانہ متعارف کرانے میں ایک لبنانی اسکالر کی کوششوں کا دخل تھا جو وہاں حصولِ علم کے لیے گیا تھا۔ ۱۶۱۵ء میں زبور سریانی اور عربی زبان میں شائع ہوئی، عربی زبان کا رسم الخط سریانی (Garshuni) شامی تھا۔[۸] ۱۷۲۳ء میں ایک یونانی کیتھولک پادری عبداللہ ذاخر حلب (شام) (جہاں اس نے عربی ٹائپ کو ۱۷۰۲ء میں ڈھالا تھا) سے ماریوحنا سابغ کی خانقاہ چلا آیا۔ یہ شویر (لبنان) منتقل ہوئے جہاں انھوں نے ایک پریس قائم کیا۔ اس پریس نے ایک سو پچاس سال کے عرصہ میں بیشمار مذہبی کتابوں کو شائع کیا، زبور بھی شائع ہوئی۔ نمونہ کے طور پر شویر طرزِ تحریر کو استعمال کرتے ہوئے یونس الجبیلی نے جو ابوعسکر کے نام سے معروف تھا بیروت

کے ایک یونانی کیتھولک خانقاہ میں ایک پریس کی بنیاد ڈالی۔ اس کی طباعتی سرگرمیاں بھی خاص طور سے زبور کے لیے وقف ہوئیں[۹] انیسویں صدی کے آغاز میں کسروان کی طامش نامی ایک خانقاہ نے قزحیا کے طرز پر شامی چھاپے خانے کی بنیاد ڈالی اور یہیں (۱۸۵۵ء) عربی مطبع قائم کیا[۱۰] اس کے علاوہ کچھ دوسرے چھاپے خانے بھی خصوصی ذکر کے مستحق ہیں مثلاً المطبعۃ الامریکیہ (۱۸۳۴)، مطبعۃ الاباءُ الیسوعیین (جو بیروت میں ۱۸۴۷ء میں قائم کیا گیا) المطبعۃ الکیتھولکیہ (۱۸۴۸)، المطبعۃ الوطنیہ (۱۸۵۵)، المطبعۃ العمومیہ (۱۸۶۰) وغیرہ۔ مذکورہ بالا چھاپے خانوں میں "المطبعۃ الامریکیہ" کو اہم مقام حاصل تھا[۱۱] اسے الی اسمتھ نے بیروت میں قائم کیا تھا، جو بہت سی امریکن مشنریز کا بانی ہے، اس نے موجودہ عربی ٹائپ کو ناکافی تصور کرتے ہوئے نئے رسم الخط کے ڈیزائن کی تلاش میں مصر اور قسطنطنیہ کا رختِ سفر باندھا بالآخر تلاشِ مقصد میں لیزگ تک جا پہنچا۔ اسی وقت سے ایک جدید ٹائپ "امریکن عربی" ٹائپ کے نام سے وجود میں آیا جسے اس کی زیرِ نگرانی ڈھالا گیا تھا[۱۲] اس وقت کے دو معروف اسکالر ناصف الیازجی (۱۷۔۱۸۰۰) اور بطرس بستانی (۸۳۔۱۸۱۹) نے ملکر عربی درس کی کتابیں اور اسکول کے نصاب کو تیار کیا۔ یہ سب کتابیں اس پریس کی اولین مطبوعات میں شامل ہیں۔ اس چھاپے خانے کا سب سے پہلا اہم کارنامہ نیو کلاسیکل عربی میں بائبل کے ترجمہ کا شائع کرنا تھا[۱۳] اس اشاعت سے پہلی بار کتاب مقدس تک رسائی آسان ہو گئی[۱۴]

عربی پریس مشرق عرب میں پہلی بار ۱۷۰۲ء میں حلب میں وجود میں آیا، اس کا سہرا بطریق (پادری) الدباس (۱۷۲۴۔۱۶۸۵) کے سر ہے[۱۵] اس کے سارے آلات غالباً Walachia سے (اس کے ایک ہجے Rumania, Wallachia بھی ہے[۱۶]) الدباس کے ذریعہ لائے گئے۔ اس کا مکمل ٹائپ عبداللہ ذاخر کے ذریعہ ڈھالا گیا (دیکھئے فوٹو نمبر ۲)۔ انھوں نے بھی ایک عربی پریس (عربی رسم الخط میں) کی بنیاد ۱۷۳۳ء میں بمقام شویر (لبنان) میں ڈالی جو ابھی تک موجود ہے۔ اس طرح حلب میں ۱۷۶۶ء میں پہلی بار زبور کی طباعت ہوئی (فوٹو نمبر ۳ دیکھئے) ۱۸۵۷ء میں ایک اور پریس وجود میں آیا۔ اسی کے ساتھ ہی ۱۸۹۸ء میں ملک دمشق میں بھی ایک پریس کا قیام عمل میں آیا۔

مصر میں عربی طباعت کا فن نپولین بوناپارٹ کے ذریعہ متعارف ہوا۔ جس نے ۱۷۹۸ء

میں بمقام قاہرہ ایک عربی پریس کی بنیاد ڈالی، جسے اس نے وٹینکن (روم) سے حاصل کیا تھا۔ فرانسیسی فاتح نے اس پریس سے اپنے نظریات کی اشاعت کے لیے عربی زبان میں بہت سے کتابچے شائع کیے[۱۱۵] اسی پریس کے طرز پر "مطبعۃ بولاق" بھی قائم ہوا۔ اس پریس کو محمد علی پاشا (۱۸۴۹ — ۱۸۰۵) نے ۱۸۲۱ء میں قائم کیا تھا[۱۱۶]۔ اس کی نگرانی کے لیے محمد علی پاشا نے ایک شامی نقولا المسابکی کو دعوت دی جو اٹلی میں چار سال قیام کے بعد متحرک یا حرکت پذیر ٹائپ سے فن طباعت کا ماہر ہو گیا، محمد علی پاشا سائنس اور ٹکنالوجی کے ارتقاء میں خصوصی دلچسپی رکھتا تھا اور اپنی فوج کو نپولین کے طور طریقہ پر منظم کرنا چاہتا تھا۔ اسی لیے اس نے ادبیات میں کم دلچسپی لی اور سائنس، انجینیرنگ، ٹکنالوجی اور فنون جنگ کے موضوعات پر کتابیں شائع کرنے میں خصوصی توجہ کا ثبوت دیا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس کے عہد میں صرف سائنسی کتابیں ہی چھپ کر منظر عام پر آئیں بلکہ ان کے علاوہ دوسری مطبوعات بھی شائع ہوئیں، مثلاً قاموس تیلیانی العربی، کتاب الآجرومیہ فی النحو، کتاب صباغۃ الحریر، سکندر اعظم کی سوانح عمری، مالٹ بورن کی جغرافیہ کا عربی ترجمہ (رفاعۃ الطحطاوی)، الف لیلہ کی کچھ کہانیاں، اور ان علماء کی کتابیں جنھیں محمد علی پاشا نے اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ بھیجا تھا، رفاعۃ طحطاوی جیسے مندوبین کے سفرنامے (مثلاً تخلیص الابریز فی تلخیص البارز) اور یورپی بالخصوص فرانسیسی مطبوعات کے ترجمے جن میں ۱۸۲۲ء میں جاری ہونے والا خدیویل رسالہ اور اخبار الوقائع المصریہ (۱۸۲۸) شامل تھے[۱۱۹]۔ محمد علی کے بعد فن طباعت کی رفتار سست پڑ گئی، اس لیے کہ اس کے جانشین عباس اول (۵۴-۱۸۴۹) کو (جو اس کا پوتا تھا) تجدد پسندی سے نفرت تھی، یہی وجہ ہے کہ ۱۸۴۹ء میں اخبار "الوقائع المصریہ" کی اشاعت موقوف ہو گئی[۱۲۰]۔ سعید پاشا (۶۳-۱۸۵۴ء) (جو اسماعیل پاشا کا سب سے چھوٹا لڑکا تھا) کے دور حکومت میں عربی طباعت کو نئی زندگی ملی۔ چنانچہ ۱۸۶۵ء میں ایک پریس "المطبعۃ القبطیۃ" کے نام سے وجود میں آیا۔ اسی زمانے میں دو معاصر شعراء شہاب الدین محمود اور سید علی الدارویش کے دیوان شائع ہوئے، اسماعیل پاشا (۷۹-۱۸۶۳ء) نے مصر کو ترقی کی راہوں پر گامزن کرنے کے لیے بھرپور کوشش کی فن طباعت کو ترقی دینے کے لیے جملہ ممکن الحصول وسائل و ذرائع استعمال کیے، اس کے عہد میں یہ فن خوب پھلا پھولا اور متعدد کتابیں شائع ہوئیں۔ مثلاً المثل السائر، اصبہانی کی الاغانی، مقدمہ ابن خلدون، غزالی کی احیاء علوم الدین

رازی کی مفاتیح الغیب، اور ابن سینا کی القانون، ابن عبد ربہ کی العقد الفرید، ابن خلکان کی وفیات الاعیان، مزید براں اخبار "الوقائع المصریہ" اور بہت سے اخبارات و رسائل نیز مجلات اس کے عہد حکومت میں منظر عام پر آئے، انھیں دنوں رفاعۃ الطہطاوی کی کتاب المرشد الامین للبنات والبنین اور پھر بنولین کی قانون کی کتاب (القوانین الفرانسیہ) کا عربی ترجمہ[۱۳۲]، مواقع الافلاک فی وقائع التلمات بھی اشاعت پذیر ہوئے[۱۳۳] اسی دوران مصر میں کئی چھاپے خانے قائم کیے گئے مثلاً مطبعۃ جامعۃ المعارف، مطبعۃ الہلال، محمد ابوسعود آفندی کا مطبعۃ وادی النیل، مطبعۃ روضات المدارس اور مطبعۃ الوطنیہ وغیرہ۔ ان میں مطبعۃ الوطنیہ کو نمایاں مقام حاصل تھا، ادب کی مذکورہ بالا تمام بنیادی کتابیں اسی پریس سے شائع ہوئیں۔

عربی چھاپے خانے کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے منکشف ہوتا ہے کہ حرکت پذیر ٹائپ سے طباعت کے کام کا پہلی بار سولہویں صدی کے وسط میں ترکی میں آغاز ہوا لیکن بہت دنوں تک مسلم علماء اسے قبول کرنے میں متذبذب رہے، اس لیے کہ کتابت اور لیتھوگراف کے علاوہ قرآن کی اشاعت کے دوسرے تمام ذرائع ان کے نزدیک محل نظر تھے، جب مصری علماء نے چھاپے خانے کے جواز کے فتاوی صادر کر دیے تو ۱۷۲۸ء میں حرکت پذیر ٹائپ سے طباعت کی آسانیاں فراہم ہوئیں، مصر میں ۱۷۹۸ء میں یہ فن رائج ہو چکا تھا لیکن اس کی ترقی کی رفتار بہت ہی سست رہی، محمد علی پاشا کے دور اقتدار میں صرف "مطبعۃ بولاق" کے قیام کا ثبوت ملتا ہے، (مطبعہ الامریکیہ کا شمار اس میں نہیں ہوگا، کیونکہ یہ ابراہیم پاشا کے دوران تسلط ۱۸۳۴ء میں بمقام بیروت قائم ہوا) عباس اول کو اس فن سے اس قدر نفرت اور بیزاری تھی کہ اس نے بولاق پریس کو بند کر دیا، اس لیے اس زمانے میں کسی نئے پریس کے قیام اور کسی کتاب کی طباعت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس کے جانشین محمد سعید نے ۱۸۶۵ء میں ایک پریس کی بنیاد ڈال کر عربی طباعت کے فن کو ترقی کے منازل پر لا چھوڑا، اسماعیل پاشا کے عہد حکومت میں بیشمار چھاپے خانوں کے قیام کے سبب فن طباعت کو برگ و بار لانے کا موقع ملا۔ اس کے عہد میں متعدد معیاری ادبی کتابیں شائع ہوئیں، دو مقام ایسے ہیں جہاں عربی فن طباعت کو غیر معمولی ترقی ملی، ایک لبنان کی عیسائی خانقاہ جہاں ۱۶۱۰ء میں عربی پریس قائم ہوئے اور دوسرے شام میں جہاں ۱۷۵۲ء میں پہلی بار لوگوں نے عربی رسم الخط کے چھاپے خانے کا مشاہدہ کیا۔ ہم لبنان اور شام کے عیسائیوں کے مرہون منت ہیں کہ انھوں نے مشرق عرب میں عربی پریس کی بنیاد ڈالی، لبنانی تارکین وطن کے ہاتھوں یہ فن

چار دانگِ عالم میں عام ہوا P.K. Hitti کے الفاظ میں "عربی طباعت کا فن عیسائیوں کی خانقاہ میں تولد پذیر ہوا، لبنانی تارکینِ وطن کے ذریعہ عربی کتب کی اشاعت کا فن دنیا کے چھ براعظموں میں پھیل گیا۔"[۱]

حواشی

[۱] اس کا حقیقی نام Giuliano della Rovere ہے، ۱۵۰۳ء میں وہ پوپ منتخب ہوا، وہ فنونِ لطیفہ کا مربی بھی تھا، وضاحت کے لیے ملاحظہ کریں کولیرس انسائیکلوپیڈیا، ۱۳/۶۶۵ (۱۹۷۶ء) - دی نیو کولمبیا انسائیکلوپیڈیا (۱۹۷۵ء) صـ۱۴۲۸، ایوری مینس انسائیکلوپیڈیا، ۷/۳۸۷ (۱۹۵۸ء)، ہیری جانس اور ایم، وی ڈکسن، ٹیلج ڈکشنری آف پیپل (۱۹۸۱ء) صـ۴۱۹، دی نیو کیمبرج انسائیکلوپیڈیا، ۲/۳۴۶ (۱۹۷۵ء) اور لپن کوٹ، پروناونسنگ ڈکشنری آف بائیوگرافی اینڈ مائتھالوجی (فلاڈیلفیا ۱۹۳۵ء) صـ۱۴۱۵

[۲] Leo کا حقیقی نام (اس کا فرانسیسی تلفظ Leon ہے) Giovannide میڈیسی تھا، یہ آرٹ، علم و ادب، فن مصوری، موسیقی اور فن تعمیرات کا مربی تھا، یہ ۱۱ مارچ ۱۵۱۳ء کو پوپ منتخب ہوا، لیو دہم کا خطاب اختیار کیا، مزید وضاحت کے لیے دیکھئے۔ دی نیو سنچری انسائیکلوپیڈیا آف نیمس ۲/۲۲۴۴ (۱۹۵۴)، کولیرس انسائیکلوپیڈیا، ۱۴/۵۰۲ (۱۹۷۶ء)، ورلڈ یونیورسٹی انسائیکلوپیڈیا ۹/۲۸۷۶ (۱۹۶۹ء) - اور لپن کوٹ پروناونسنگ ڈکشنری آف بائیوگرافی اینڈ مائتھالوجی ص ۱۵۲۷۔

[۳] دیکھئے پی کے ہٹی، لبنان ان ہسٹری (۱۹۵۷ء) ص ۴۵۷ اور حنا الفاخری تاریخ الادب العربی (چھٹا ایڈیشن بیروت) ص ۹۰۷۔

[۴] Venice کا عربی نام ہے (جو Adriatic سمندر کے سرے پر اٹلی میں واقع ہے) دیکھئے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ۱/۷۹۳، (۱۹۲۳ء)۔ بندوقیہ (Venice) میں کسی عربی پریس کے قیام کا کہیں کوئی واضح ذکر نہیں ملتا۔

[۵] دیکھئے عمر الدسوقی، فی الادب الحدیث، ۱/۵۱ (نواں ایڈیشن بیروت)

[۶] وضاحت کے لیے دیکھئے جرجی زیدان، کتاب اللغۃ العربیہ، ۴/۴۴

[۷] دیکھئے حنا الفاخری، ص ۹۰۷

[۸] پی کے ہٹی، ہسٹری آف سیریا (۱۹۵۷ء) ص ۶۴۶۔ نیز دیکھئے پی کے ہٹی، ہسٹری آف دی عربس (۱۹۷۵ء) ص ۷۴۷۔

۹ لبنان ان ہسٹری، ص ۴۵۷ ۱۰ ایضاً

۱۱ یہ ۱۸۳۴ء میں مالٹا سے بیروت منتقل ہوگیا۔

۱۲ جارج اینطونیس، دی عرب اویکننگ (۱۹۵۴ء) ص ۴۲۔

۱۳ بائبل کے ترجمہ کے سلسلے میں امریکن مشنریز نے مذکورہ بالا اسکالرز ناصف الیازجی، بطرس البستانی اور یوسف الاسیر کی خدمات حاصل کیں۔ ۱۴ لبنان ان ہسٹری ص ۴۵۶

۱۵ ہسٹری آف سیریا ص ۴۷۷ ۱۶ وضاحت کے لیے دیکھئے انسائیکلوپیڈیا امریکنا، ۲۸/۲۶۹ (۱۹۷۶ء) - انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، ۱۰/۵۱۷، (۱۹۷۸ء)

۱۷ ہسٹری آف دی عربس، ص ۴۵۷

۱۸ دیکھئے آر، اے نکلسن، اے لٹریری ہسٹری آف دی عربس (۱۹۴۱ء) ص ۴۶۸۔

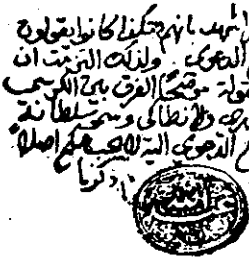
۱۹ یہ اخبار ابھی تک شائع ہو رہا ہے۔

۲۰ عباس اول مصر کے قائم مقام حکمراں کی حیثیت سے ۱۸۴۸ء میں ابراہیم پاشا کے جانشین ہوئے۔ ۱۸۴۹ء میں محمد علی کے انتقال کے ایک ہی سال بعد وہ پاشا بن گئے۔ دیکھئے انسائیکلوپیڈیا امریکنا ۱۹۷۶ء ۱/۸۔ ۲۱ جب اسماعیل پاشا کا دور آیا تو ۱۸۶۳ء میں یہ دوبارہ شائع ہونا شروع ہوا، دیکھئے عمر الدسوقی ص ۵۶۔

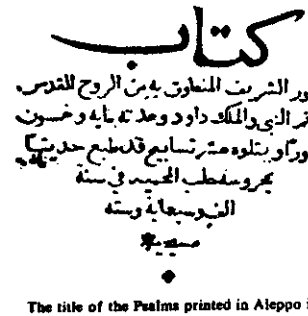
۲۲ نپولین لا کا فرانسیسی زبان سے عربی میں ترجمہ ہوا، یہ خدمت رفاعۃ الطہطاوی نے انجام دی۔

۲۳ یہ ترجمہ بھی رفاعۃ الطہطاوی نے ہی کیا ہے۔ ۲۴ لبنان ان ہسٹری ص ۴۵۸

نمبر ۱



نمبر ۲



The title of the Psalms printed in Aleppo in 1706

A sample of the script of 'Abd Allah al-Zakhir alongwith his stamp

تعارف وتبصرہ

اسلام اور جدید سائنس

مولانا محمد شہاب الدین ندوی

صفحات ۱۲۰، قیمت ۱۸ روپئے۔ فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ بنگلور

تمام مذاہب عالم کے برخلاف اسلام ایک ایسا متوازن مذہب ہے جس نے عقل انسانی کو ایک خاص مقام عطا کرکے نئے مسائل کے حل میں اس کے کردار کی تعیین فرمادی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عالم اسلام میں ہر دور کے علماء اپنے اپنے زمانے کی ضرورت اور انسانوں کی عام عقلی سطح کے مطابق دین کی تشریح وتوضیح کرتے رہے ہیں۔ یہ عمل دراصل ایک طرح کا اجتہاد ہے جس کی صحت کے لیے اسلام کی گہری بصیرت کے ساتھ نئے حالات ومسائل سے کماحقہٗ واقفیت ایک لازمی شرط ہے۔ اگر ایک عالم دین کو جدید حقائق کا صحیح ادراک ہو تو اس سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ دین مبین کی تشریح صحت کے ساتھ کرے گا ورنہ نہیں۔

پیش نظر کتاب جس میں اسلام اور جدید سائنس سے متعلق گفتگو کی گئی ہے اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ مصنف کے ذہن میں سائنس کا مفہوم ہنوز پوری طرح واضح نہیں ہے۔ انھوں نے سائنس اور قرآن کے درمیان بعض سطحی مناسبتوں سے متاثر ہوکر یہ رائے قائم کرلی ہے کہ سائنس ایمان کی تقویت کا سبب ہے۔ حالانکہ سائنس کا اندرونی ڈھانچہ کچھ اس انداز سے ترتیب دیا گیا ہے کہ ایمانیات کی اس میں کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔

مصنف نے چار ابواب میں کتاب کی تقسیم کی ہے۔ ہم صرف پہلے دو ابواب پر بحث کریں گے۔ اس کی روشنی میں باقی ابواب پر بھی غور کیا جاسکتا ہے۔ پہلے باب میں سائنس وٹکنالوجی کو خلافتِ ارض سے منسوب کرتے ہوئے اس کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ فاضل مصنف نے یہاں سائنس کی بے انتہا سادہ تعریف کرکے مسئلہ کو بہت آسان کردیا ہے۔ فرماتے ہیں "سائنس نام ہے دنیا میں پائی جانے والی مادی اشیاء اور ان کی ساخت و

پرداخت کے مطالعے کا"۔ اس طرح علم الاشیاء کو سائنس کا نام دے کر مولانا خلافتِ ارض کو سائنس و ٹکنالوجی سے جوڑ دیتے ہیں۔ سائنس محض علم الاشیاء کا نام ہوتا اور وہ مادّی اشیاء کی بس ساخت و پرداخت پر ہی گفتگو کرتی تو یقیناً مولانا کی بحث بہت بامعنی، مثبت اور کامیاب کہی جاسکتی تھی۔ لیکن سائنس کو اس کے فلسفہ، اس کے زاویۂ نگاہ اور اس کے مقصد سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے پیشِ نظر میرے خیال میں موجودہ سائنس خلافتِ ارض کے بجائے استحصالِ کائنات کا ذریعہ ہے۔

دوسرے باب میں مولانا نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام اور سائنس کے درمیان مقصد اور طریقۂ کار کی سطح پر ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں موصوف نے پہلے اسلام کے نظریۂ کائنات کو چھ نکات میں پیش کیا ہے۔ اس کے بعد اسلام کے علمی انداز سے — جسے وہ دراصل سائنسی انداز سمجھتے ہیں — بحث کی ہے۔ پھر مسلمانوں کی تاریخ سے ہلکا سا خاکہ پیش کرتے ہوئے قارئین کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ فلسفے کے برخلاف سائنس اور اسلام کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔ اسی بحث میں مولانا نے اسلامی دور کی بعض شخصیتوں کے ذکر کے بعد لکھا ہے کہ" اُس دور میں سائنس ہمیشہ مذہب کے تابع رہی اور ایک دوسرے سے تعارض و تضاد کا کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوسکا، جس طرح کہ عصرِ حاضر میں بعض لوگوں کو سائنسی تحقیقات اور مذہبی تعلیمات میں تصادم و ٹکراؤ نظر آتا ہے"۔ (صہ ۵۵) اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ سائنس اور مذہب میں کچھ تضاد ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مذہب کی تابع نہیں بلکہ اُس سے باغی ہے۔ جس دور میں علم کائنات مذہب کے تابع تھا اس کا نام سائنس نہ تھا اور جب وہ مذہب سے باغی ہوا تو اس کا نام سائنس رکھا گیا۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ موجودہ سائنس یا سائنسی نقطۂ نظر مذہب سے بغاوت کے ہم معنی سی ہوکر رہ گئی۔ اس لیے سائنس اور اسلام کے درمیان مفاہمت شاید ایسی ہی مفاہمت ہے جیسی کہ یہودیت اور اسلام کے درمیان پائی جاتی ہے کہ جب ایک مذہب اللہ کی ہدایت یعنی توریت کا پابند تھا تو عین اسلام تھا، لیکن جب یہ پابندی اٹھ گئی تو یہودیت کے نام سے مشہور ہوا گو کہ اسلام کے ساتھ مشابہت پھر بھی باقی رہی۔

مذہب اور سائنس کے درمیان ٹکراؤ کی اصل وجہ مولانا کے نزدیک کلیسا کی نااہلی

ہے۔ میرے خیال میں اس نااہلی میں مسلمان بھی برابر کے شریک ہیں کیونکہ انھوں نے ایک قیمتی علم کو ترک کرکے ساری بساط کلیسائیوں کے ہاتھ میں دے دی اور علم کائنات مذہب سے آزاد ہوکر سائنس کی شکل اختیار کرگیا۔ مولانا کے نزدیک "اسلام کے سوا کوئی دوسرا مذہب نہیں جو ان غلط نظریات و اوہام کی تردید کرکے علمی و عقلی اور سائنٹفک انداز میں مادّیت اور نیچریت اور الحاد و دہریت کا مقابلہ کرسکے" (ص ۵۶) کلیسا کے پیدا کردہ غلط نظریات و اوہام کی علمی، عقلی اور سائنٹفک تردید تو سمجھ میں آتی ہے، لیکن خود سائنس نے جو مادّیت، نیچریت اور الحاد و دہریت پیدا کی ہے، اس کی علمی، عقلی اور سائنٹفک تردید کیسے ہو؟ مولانا نے اس کی وضاحت نہیں کی ہے۔ ذرا اس کی بھی وضاحت ہوجاتی تو اچھا تھا۔

"تمام انبیاء کی مشترکہ تعلیم" کے عنوان کے تحت مختلف تفاسیر کے حوالے سے مولانا نے طاغوت کی تشریح فرمائی ہے۔ موجودہ اسلوب کے مطابق وہ طاغوت کو "خودساختہ ازموں" سے تعبیر کرتے ہوتے کمیونزم، سوشلزم، نیشنلزم، فاشزم، ٹیڈی ازم، ہپی ازم وغیرہ کو رد کرتے ہیں۔ اگر اس فہرست میں "سائنٹزم" کا اضافہ کردیا جائے تو مولانا کو اعتراض نہ ہونا چاہیے۔ علم جدید، علوم عقلیہ، علم کائنات، علم فطرت وغیرہ اصطلاحات آج کل سائنس ہی کے معنی میں استعمال ہوتی ہیں اور سائنس چونکہ وحی کی ہدایت سے آزاد ہوکر وجود میں آئی ہے اس لیے اس لفظ اور اس کے دوسرے اردو متبادل الفاظ کے ساتھ وہ تصورات شامل ہوجاتے ہیں جو دراصل وحی سے آزاد ہونے کی بنا پر اس علم کو اسلام کے ساتھ جوڑنے میں مانع ہیں۔ ابھی تک کوئی ایسی اصطلاح وضع نہیں کی گئی ہے جو اُس مجموعۂ علم کائنات کے لیے استعمال ہو جس میں تجربی علوم اور وحی سے حاصل شدہ علوم کو مناسب اور صحیح جگہ دی گئی ہو۔ (ڈاکٹر) محمد ریاض کرمانی۔

اسلامی معاشرت پر مولانا سیّد جلال الدین عمری کی کتاب

مسلمان خواتین کی ذمہ داریاں

صفحات ۶۶۔ قیمت ۳/ روپئے

ملنے کا پتہ: مکتبہ تحقیق وتصنیف اسلامی پان والی کوٹھی۔ دودھ پور۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲